اردو ادبیات کا نقیب اور تخلیق و تنقید کا اشاریہ

ماہنامہ

سخن دان

ستمبر 2021ء

اردو ادبیات کا نقیب اور تخلیق و تنقید کا اشاریہ

ستمبر 2021ء ☆☆☆☆☆☆☆☆ شمارہ نمبر 05، جلد 01

ماہنامہ

اسلام آباد

سرپرست

ڈاکٹر افتخار الحق

dr.iftikhar2011@gmail.com

مدیر

غلام مصطفیٰ دائم

gmdaaim133@gmail.com

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر خالد علوی

یاسر اقبال

نیلم ملک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مشمولات

اداریہ	مدیر	04

مضامین

ساحر لدھیانوی اور بنتِ حوا	ڈاکٹر عالیہ	07
ادب اور سیاست	ڈاکٹر افتخار الحق	18

افسانے

گڑیا	ذکیہ مشہدی	21
میا	نجمہ ثاقب	27
گیلی مٹی کا بت	کرن نعمان	33

غزلیات

پُرکھوں کے آثار اٹھائے، دُور نکلنے والا تھا	احمد جہاں گیر	38
ممکن ہے کون و مکاں سے آگے کوئی در نکلے	صہیب امین	39
زندگی کی جھاڑیوں سے باغ کا رستہ لیا	ندیم راجہ	40
دیکھ! شہزادی! اک تیرے ہونٹوں کی جنبش سے کیا بن گیا!	سعید شارق	42
پتنگا جل اٹھا لیکن دِیے میں ضم نہ ہوا	کائنات احمد	43

نظمیں

بھوسے کی کتھا	علی زیوف	44
بیوہ عورتوں کا تہوار	سدرہ سحر عمران	46
ٹرائی اینگل	مہناز انجم	47
دھوپ کا ٹکڑا	طاہر راجپوت	48
دِیا طاق سے گر گیا ہے	ثاقب ندیم	50

اداریہ

اداریہ

ناقوس

سخن دان، ادب کا مستقبل اور تاریخی شعور

آج کا اداریہ ایک اہم سوال کا جواب کریدنے کی سعی پر مشتمل ہے۔

انسانی تاریخ کے کلی تناظرات اس پر شاہد ہیں کہ ادب ہمیشہ انسان کا ضروری مسئلہ رہا ہے۔ جدید ذہن سائنس اور ٹیکنالوجی کے نو بہ نو انکشافات سے مرعوب نہ بھی دکھائی دے، اس کا ایک فطری تقاضا تہذیبِ انسانی کے تشکیلی عناصر میں یوں گندھا ہوا ہے کہ اسے غیر متعلق یا غیر فطری نہیں کہا جا سکتا، اور وہ یہ ہے کہ ادب بحیثیت ایک جمالیاتی آلۂ حیات مستقبل میں کس زاویۂ وجود میں اپنی جگہ مستقلاً بنائے رکھنے کا داعی ہو سکتا ہے؟ اور جبکہ ہمارے نفسی وجود کا مظہر ادب نہیں، بایں طور ہماری محدود جذباتی زندگی کی تسکین کے ایک ادنی وسیلے سے بڑھ کر ادب کا کیا کردار ہے یا ہو سکتا ہے؟

دراصل یہ سوال جدید ذہن کی پیداوار نہیں۔ کیونکہ ادب کی موت کا اعلان تبھی ہو چکا تھا جب ان خدشات کا اظہار وجود پا چکا تھا کہ وہ انسان ہی نہیں رہا جس کا بنیادی مسئلہ ادب ہے۔ لیکن اگر یہی اصول منطبق کریں تو ادب کو اپنی پیدائش کے ساتھ ہی مر جانا چاہیے تھا کیوں کہ ادب کسی بھی انسانی تہذیب کا کلیدی منشا نہیں رہا۔ تو پھر سوال ابھرتا ہے کہ پھر ادب کا مستقبل کیا ہے؟

اس کا کوئی نپا تلا جواب دینے سے ہم فی الوقت قاصر ہیں، کیوں کہ ہم نے ادب کو محض جذبۂ اظہار کی تسکین کا ایک آلۂ کار سمجھ رکھا ہے اور کچھ نہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم ادب سے کوئی فی الواقع تعمیری یا تشکیلی توقعات وابستہ کر لیں۔ ادب کا کام کبھی بھی تعمیر یا تشکیل نہیں رہا۔ ادب ہمیشہ ان دونوں احوال کا شاہد رہا ہے۔ برصغیر میں بیسیوں تاریخی تغیرات کی یورش زندہ مثال ہے۔ سرسید، ڈپٹی نذیر احمد، غالبؔ، حالیؔ وغیرہ یہ سب وہ لوگ ہیں جنھوں نے سیاسی، سماجی اور عالمی تغیرات کے اثرات کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ ان کا اظہار بھی کیا۔ تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادب ہمیشہ سے تغیراتِ زمانہ کا عینی شاہد بنتا رہا ہے۔

دراصل ادب کا مستقبل ایک ضمانت سے بندھا ہے اور وہ ہے تاریخی و تہذیبی شعور۔ تاریخی سرخی گرد پڑنے سے مدھم یا روپوش ہو سکتی ہے لیکن ادب پارہ اپنے طرزِ تسکین میں کامل اور وجودی عمر میں پائیدار ہوتا ہے۔ تاریخی شعور کی کارفرمائی از منۂ ثلاثہ کو باہم پیوستہ رکھتے ہوئے ان کے مابین متنوع تعلقات اور نتائج و امکانات کا حال رقم کرتی ہے۔ تو جو میں اوپر کہہ رہا تھا کہ ادب زمانی تغیرات کا عینی شاہد ہوتا ہے، وہی بات یہاں دہراؤں گا کہ تاریخی شعور کھلی آنکھوں سے ماضی و حال کے سیاسی، سماجی، ادبی اور مذہبی احوال کو جوڑ کر مستقبل کے امکانات کا اشارہ کرنے کے

لیے ایک چشمِ بینا اور ذہنِ درّاک کے طور پر ابھرنے والے اجتماعی شعور کا ضروری حال ہے۔ اب اس سے بڑھ کر ادب کی اہمیت اور کیا ہو؟

ادب کا مستقبل جاننے سے قبل یہ سمجھنا بھی نہایت ضروری ہے کہ ہماری ذہنی و تہذیبی ساخت میں ادب اور تاریخی شعور کے مابین تعلق کی کیا نوعیت ہے؟ کیوں کہ تاریخی شعور ہمیشہ شخصی توقعات کی وابستگی سے آزاد ہوتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ادب سے ہماری وہی Expectations ہیں جو سائنس یا جدید ٹیکنالوجی سے لیس مغربی معاشرہ فراہم کر رہا ہے۔ ایسے میں ہماری توقعات کی تکمیلی صورت نہ نظر آئے تو قصور کس کا؟ بے محل توقعات کا یا ادب کا؟

میں سمجھتا ہوں کہ ادب کا مقصد اخلاقی یا تہذیبی سپاٹ پن میں ایک جمالیاتی رو کی دریافت اور اس کا کلی تفاعل ہے۔ جمالیاتی سرشاری کوئی نظریہ نہیں بلکہ یہ تسلیم شدہ احوال و معتقدات کی تزئین کرتی ہے۔ ادب کی بنیاد اسے بروئے کار لا کر تفہیمِ حیات کی آزادانہ سعی کرنے سے عبارت ہے۔ سلیم احمد کی زبانی:

> فلسفے اور سائنس کی تجریدی سطح کے علاوہ ذہنی عمل کی ایک اور سطح بھی ہے جس پر انسانی ذہن اپنے محسوساتی اور جذباتی تجربوں کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ ان کی لذت یا کرب کو سمجھتا ہے، ان کے خیر یا شر ہونے پر محاکمہ کرتا ہے۔ زندگی کے غم و نشاط، درد و داغ، سوز و ساز کا ادراک کرتا ہے۔ صرف یہی نہیں، ذاتی زندگی کو پوری انسانیت کے بالمقابل رکھ کر ان پر غور کرنا، ان کی قدر و قیمت پرکھنا، ان کی معنویت کو دریافت کرنا اور پھر اس کے ذریعے ایک بھرپور زندگی کی صورت گری کرنا، یہ سب کام اسی ذہنی عمل کے ذریعے انجام دیئے جاتے ہیں اور اس عمل کا نتیجہ ہے ادب۔

اگر ادب بحیثیت ایک مسلمہ حقیقت دعویٰ کرے کہ وہ اپنے اصول پر زندہ ہے تو اس کا یہ دعویٰ ظاہر ہے باطل نہ سہی، مکمل سچ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھیں تو انسان اپنے اصول پر حالتِ حیات میں نہیں ہے تو گویا وہ فطری ساخت میں تو زندہ ہے لیکن مقصدی احوال میں مردہ یا نیم مردہ ہے۔ تو جب انسان ہی اپنے اصول پر زندہ نہیں تو ادب جو کہ انسان کی ایک جمالیاتی سرگرمی ہے، یہ کیسے پائندہ رہ سکتا ہے؟ اسی خدشے کے پیشِ نظر غالباً ادب کی موت کا اعلان کیا گیا۔ لیکن یہ بے محل توقعات کا شاخسانہ تھا۔

ادب ایک حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا کہ اس کی مدد سے ہم چیزوں کے مابین ایک جمالیاتی وحدت نہ صرف دریافت کر سکنے کے کامیاب عمل سے گزر سکیں گے بلکہ شعور اور وجود کی یکجائی کا سامان بھی کر سکیں گے۔

عالمِ وجود کی سب سے بڑی حقیقت خدا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ خدا کو ماننے کی تمام تر تفصیلات اور دلائل کے باوجود اگر ہمارا شعوری حال کسی جمالیاتی سرشاری کی کمک فراہم نہیں کرتا تو خدا کا اقرار باوجود دلائل کے انبار کے ایک زبردستی کا اقرار ہے۔ ادب اقرار کرنا سکھاتا ہے۔ ادب اگر واقعی تخلیقی ادب ہے تو وجودِ حق کی تسلیم کی پہلی اور آخری دلیل ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بجا ہے کہ ادب پر موت حرام ہے۔

معذرت نامہ :

آخر میں زیرِ نظر شمارے کی قدرے تاخیر پر قارئین سے اعتذار چاہتا ہوں کیوں کہ :

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

علامہ محمد اقبالؔ

مضامین

ڈاکٹر عالیہ
شعبۂ اردو
ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کالج
دہلی یونیورسٹی، دہلی 110094

ساحرؔ لدھیانوی اور بنتِ حوا

عبدالحئی ساحرؔ لدھیانوی اپنی ماں سردار بیگم کی اکلوتی اولاد تھے، اس لیے ان کی تمام تر توجہ ساحرؔ پر ہی تھی۔ انھوں نے اپنے شوہر چودھری فضل محمد پر مقدمہ بھی اپنے اسی بیٹے کی خاطر دائر کیا تھا۔ چوں کہ ساحرؔ کے والد چودھری فضل محمد ایک ظالم قسم کے زمین دار تھے اور انھوں نے صرف اولادِ نرینہ کی خاطر ساحرؔ کی ماں سردار بیگم سے 1920ء میں گیارھواں نکاح کیا تھا، اس لیے فضل محمد کی جائیداد میں ساحرؔ کا حق حاصل کرنا زن و شوہر کے درمیان مقدمے کی وجہ بنا۔ گیارھویں بیوی سے بیٹا ہونے کے باوجود بھی فضل محمد کا رویہ سردار بیگم کے تئیں اچھا نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سردار بیگم اپنے بیٹے کے ساتھ الگ رہیں اور اسے اچھی تعلیم دلائی۔ جواں سال سردار بیگم نے اپنے بیٹے کی پرورش کے لیے بہت سی کلفتیں اٹھائیں جن میں سے ایک تنہائی کی زندگی بسر کرنا بھی ہے۔ ایک مجبور اور بے بس عورت پر مرد اساس معاشرے کا ظلم و جبر ساحرؔ نے بچپن سے ہی بہت قریب سے دیکھا۔ شاید اس کا اثر ان کے ذہن پر پڑا اور معاشرے کے دیگر افراد کی طرح ان کی بھی ترحم آمیز نگاہیں اس کمزور طبقہ پر مرکوز رہیں۔ بات طویل ہو جائے گی اگر میں کشور ناہید کی خود نوشت سوانح 'بری عورت کی کتھا' کے عنوان پر سوال اٹھاؤں کہ 'بری عورت کی کتھا' کیوں؟ صرف 'عورت کی کتھا' کیوں نہیں؟ اردو کی ایک بڑی فیمینسٹ شاعرہ خود ہی 'عورت' کا لفظ استعمال کرنے سے پہلے 'بری' کی صفت استعمال کر رہی ہیں! انھوں نے اپنی اس بات کو ثابت کیا ہے کہ: ''ہمارے معاشرے میں عورت ایک قالین کی طرح ہے، لوگ اپنے عیش و آرائش اور آسودگی کے لیے قالین بچھاتے ہیں اور پھر اسے پیروں سے روندتے بھی ہیں۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ساحرؔ نے عورت کو کس طرح دیکھا ہے؟ حالاں کہ ساحرؔ کی شناخت ایک Feminist شاعر کی حیثیت سے قائم نہیں ہے، پھر بھی ساحرؔ نے اپنے کلام میں عورت کو اہم مقام دیا ہے۔ ساحرؔ کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ ان کی ماں نے بڑی محنت و مشقت سے ان کی پرورش کی ہے، یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی ماں سے جی جان سے محبت کرتے تھے۔ احمد راہیؔ کہا کرتے تھے کہ ساحرؔ نے زندگی میں صرف ایک عورت سے محبت کی ہے اور وہ عورت ہے سردار بیگم۔ عورت کی عظمت کا احساس انھیں بچپن سے ہی تھا۔ اسی احساس سے پر ان کی نظم 'عورت' ہے۔ اس نظم کا ایک حصہ:

لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں
روح بھی ہوتی ہے اس میں یہ کہاں سوچتے ہیں
روح کیا ہوتی ہے اس سے انھیں مطلب ہی نہیں

وہ تو بس تن کے تقاضوں کا کہا مانتے ہیں
روح مر جائے تو ہر جسم ہے جلتی ہوئی لاش
اس حقیقت کو سمجھتے ہیں نہ پہچانتے ہیں
کتنی صدیوں سے یہ وحشت کا چلن جاری ہے
کتنی صدیوں سے ہے قائم یہ گناہوں کا رواج
لوگ عورت کی ہر اک چیخ کو نغمہ سمجھیں
وہ قبیلوں کا زمانہ ہو کہ شہروں کا سماج

مندرجہ بالا اشعار سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ساحرؔان لوگوں پر طنز کر رہے ہیں جو عورت کو صرف ایک پرکشش وجود سمجھتے ہیں اور ہندوستان میں یہ چلن صدیوں سے جاری ہے۔ خواہ شہر ہوں یا گاؤں تقریباً سبھی جگہ عورت پر ظلم واستحصال کی روایت سیکڑوں برس سے چلی آرہی ہے۔ ساحرؔ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور اس قسم کے لوگوں کو وحشی قرار دیتے ہیں :

ہم جو انسانوں کی تہذیب لیے پھرتے ہیں
ہم سا وحشی کوئی جنگل کے درندوں میں نہیں

اور مرد اساس معاشرتی نظام کی مذمت کرتے ہیں۔ پدرشاہی نظام جو ہندوستان میں صدیوں سے قائم ہے، ساحرؔ اس کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے بلند بانگ لہجے میں کہتے ہیں :

عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا، جب جی چاہا دھتکار دیا
تلتی ہے کہیں دیناروں میں، بکتی ہے کہیں بازاروں میں
ننگی نچوائی جاتی ہے عیاشوں کے درباروں میں
یہ وہ بے عزت چیز ہے جو بٹ جاتی ہے عزت داروں میں
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا
مردوں کے لیے ہر ظلم روا، عورت کے لیے رونا بھی خطا
مردوں کے لیے ہر عیش کا حق، عورت کے لیے جینا بھی سزا
مردوں کے لیے لاکھوں سیجیں، عورت کے لیے بس ایک چتا
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا
جن سینوں نے ان کو دودھ دیا، ان سینوں کا بیوپار کیا
جس کوکھ میں ان کا جسم ڈھلا، اس کوکھ کا کاروبار کیا
جس تن سے آئے کونپل بن کر، اُس تن کو ذلیل وخوار کیا
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا
عورت سنسار کی قسمت ہے، پھر بھی تقدیر کی ہیٹی ہے

اوتار پیمبر جنتی ہے، پھر بھی شیطان کی بیٹی ہے
یہ وہ بدقسمت ماں ہے جو بیٹوں کی سیج پہ لیٹی ہے
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا

ساحرؔ نے نہ صرف اپنی ماں کو اذیت بھری زندگی گزارتے ہوئے دیکھا بلکہ ان کی نظر سماج میں موجود ان عورتوں پر بھی تھی جو دن بھر محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتی ہیں۔ ساحرؔ کا بچپن اپنی نانی کے یہاں گزرا۔ اس زمانے کا ذکر ان کے دوست حافظ ؔلدھیانوی نے واضح انداز میں کیا ہے:

> ساحر کی رہائش بالاخانے پر تھی۔ مکان کے سامنے چھوٹے چھوٹے کمروں میں کوئلہ چننے والیاں اور مزدوری کرنے والے لوگ رہتے تھے۔ کوئلہ چننے والیاں سارا دن ریلوے لائن پر بکھرے ہوئے کوئلے اکٹھا کرتیں اور دوکاندار کے ہاتھوں بیچتیں۔ ان کا لباس پھٹا ہوتا تھا۔ جسموں پر جابہ جا کوئلوں کی سیاہی پھیلی ہوتی تھی۔ یہ سب غربت کے نشانات، افلاس کی تصویریں، مظلومیت کے پیکر شب و روز ساحرؔ کے سامنے رہتے۔ [01]

چنانچہ ساحرؔ کی شاعری میں ہندوستانی عورت کی بے حرمتی کا شدید احساس ملتا ہے۔ ان کی کئی نظمیں مثلاً 'چکلے'، 'صبحِ نوروز' اور 'سرزمینِ یاس' ہندوستان کے سماجی و تاریخی پس منظر کی عکاس قرار دی جا سکتی ہیں۔ نظم 'صبحِ نوروز' ساحرؔ نے نئے سال کے موقعے پر کہی تھی جس میں اعلیٰ اور نچلے طبقے کی زندگیوں کے فرق کو روشن کیا گیا ہے۔ متموّل لوگوں کے لیے نیا سال بہت سے تحفہ تحائف اور خوشیاں لے کر آتا ہے اس کے برعکس نادار طبقے کے لوگ نئے سال کے پہلے دن بھی بھوک و افلاس سے دوچار رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اناج پیدا کرنے والے ایک کسان کی بیٹی معاشی مجبوریوں کے تحت تونگروں کی ہوس کا شکار بنتی ہے۔ ساحرؔ اس نظم میں اس جانب اشارہ کرتے ہیں:

نکلی ہے بنگلے کے در سے
اک مفلس دہقان کی بیٹی
افسردہ مرجھائی ہوئی سی
جسم کے دکھتے جوڑ دباتی
آنچل سے سینے کو چھپاتی
مٹھی میں اک نوٹ دبائے
جشن مناؤ سالِ نو کے

ساحرؔ کی نظم 'چکلے' ان کی مقبول ترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس نظم میں ساحرؔ نے اپنے دیس کے قحبہ خانوں کی حقیقت کو بہت واضح اور بے باک انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی یہ خوبی ہے کہ جس موضوع پر بھی وہ قلم اٹھاتے ہیں قاری اس کی روح تک سے واقف ہو جاتا ہے۔ نہایت ہی جرأت اور بے باکی کے ساتھ ساحر نے اپنے بوسیدہ معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ساحر کی اس شاہکار نظم کو گرودت کی فلم 'پیاسا' کے ذریعے عوام تک پہنچایا گیا اور بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔ نظم کے چند اشعار:

یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے

کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں
تعفن سے پُر نیم روشن یہ گلیاں
یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں
یہ بھوکی نگاہیں حسینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں
مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت، زلیخا کی بیٹی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

یہ نظم پڑھ کر قحبہ خانوں کے تمام بد نما منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ اس نظم کے ذریعے ساحرؔ نے عوام کو ہندوستانی عورت کی زندگی کی حقیقت سے آشنا کیا ہے جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ساحرؔ ایک سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی کے مختلف پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ شاعری میں اتنے بے باک، بلند آہنگ اور واضح ترقی پسند مزاج کے حامل نظر آتے ہیں تو دوسری طرف رومان کے خوشگوار ماحول سے بھی بخوبی آشنا دکھائی دیتے ہیں۔ ساحرؔ کی زندگی میں کئی خواتین آئیں۔ ان کی زندگی کے ہر دور میں کوئی نہ کوئی دوشیزہ یا عورت ان کے شب و روز کا حصہ بنی رہی لیکن ان کی ہر محبت ناکام ہی رہی۔ ساحرؔ کے پہلے عشق کا جو ذکر ملتا ہے وہ لدھیانہ گورنمنٹ کالج کے زمانے کا ہے۔ کالج کی ہی ایک طالبہ پریم چودھری (ڈاکٹر انور ظہیر انصاری نے مہندر چودھری لکھا ہے) ساحرؔ کی زندہ دلی، سیاسی دلچسپیوں اور بے باک تقریروں کی وجہ سے ان پر فدا تھی۔ ساحرؔ کے ترقی پسندانہ سیاسی افکار و نظریات سے وہ بہت متاثر تھی۔ چوں کہ اس کے والد بھی برٹش سامراج کے خلاف تھے اس لیے وہ بھی اسی نظریے کی پیروکار تھی اور سیاست سے دلچسپی رکھتی تھی۔ ساحرؔ جب کالج میں سیاسی تقریریں کرتے تو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ پریم چودھری کے احساس و جذبات کو زبان دے دی ہے۔ ساحرؔ اور پریم چودھری کے درمیان قریبی تعلقات قائم ہو چکے تھے اور ساحرؔ کی دیوانگی کی انتہا یہ ہوئی کہ پریم چودھری کے کچھ دن کالج نہ آنے پر اپنی جان خطرے میں ڈال کر وہ اس کے گاؤں تک چلے گئے تھے۔ لیکن ساحرؔ کی یہ پہلی محبت زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہی۔ پریم چودھری کو تپ دق کے مرض نے اپنی گرفت میں لے لیا اور یہی مرض اُس کے موت کی وجہ بنا۔ ساحرؔ اس سانحے سے شدید غم زدہ ہوئے اور نظم 'مرگھٹ' کہی جو ان کے عشقیہ جذبات کی سچی نمائندگی کرتی ہے:

مرے تصوراتِ کہن کی امیں ہے تو
مرگھٹ کی سرزمیں میں مقدس زمیں ہے تو
اک بےوطن اسیرِ محن کا سلام لے
آزردۂ بہارِ چمن کا سلام لے
فطرت ترے حرم پہ تقدس فشار ہے
تو میرے دل کی خاک کی سرمایہ دار ہے
کوثر میں وہ دھلی ہوئی باہیں بھی جل گئیں
جو دیکھتی تھیں اب وہ نگاہیں بھی جل گئیں
معصوم قہقہوں کا ترنم بھی مٹ گیا
جھینپی ہوئی نظر کا تبسم بھی مٹ گیا

اس کے بعد کالج کے ہی زمانے میں ایک لڑکی بریندر کور آئی جس کے ساتھ ساحرؔ کا جذباتی رشتہ قائم ہوا اور دونوں کی محبت کے چرچے عام ہو گئے۔ بریندر کور ایک اعلیٰ سکھ خاندان کی لڑکی تھی جہاں عشق و عاشقی معیوب سمجھی جاتی تھی۔ نہ صرف اس لڑکی کے خاندان میں عشق کرنا جرم تھا بلکہ معاشرہ بھی اسے قبول نہیں کر سکا۔ رسوائی کے خوف سے بریندر کور اس عشق کو آگے نہیں بڑھا سکی اور یقیناً اس کا اثر ساحرؔ کے ذہن میں رہا ہو گا جب انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

> ہمارا سماج ایک جنسی سماج ہے۔ یہاں مرد کا بول بالا ہے۔ اس لیے ہمارے یہاں کی عورتیں، مردوں کے ساتھ آزادانہ میل جول نہ رکھ سکنے کی وجہ سے محبت کے گورکھ دھندے سے دور ہی رہتی ہیں، اور اگر کوئی عورت بھولے بھٹکے محبت کر بھی لے تو سماج کی بندش اتنی مشکلات پیدا کر دیتی ہیں کہ وہ اکثر بےوفائی کر کے اپنی جان چھڑاتی ہے۔ [02]

کالج میں ساحر کی انقلابی اور رومانوی شاعری عروج پر تھی۔ وہ کالج کی یونین میں پیش پیش رہتے تھے اس لیے وہ اس کے صدر منتخب کیے گئے۔ ساحر فکری طور پر روشن خیال، سامراج مخالف اور سیکولر تھے۔ ان کی روشن خیالی نے ہی کالج میں مخلوط تعلیم (Co.Ed) شروع کرنے کی آواز اٹھائی، خوب ہنگامہ آرائی کی اور آخر کار کالج سے نکالے گئے۔ لیکن اب نوجوان نسل کے لیے ساحرؔ ایک ہیرو کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ ساحر کی دلفریب شخصیت ہر نوجوان کو متاثر کرتی تھی۔ یہی زمانہ تھا جب ایشر کور ان کی زندگی میں آئی۔ ایشر کور کی آواز جادوئی تھی۔ ساحرؔ کالج اسٹوڈینٹس یونین کے صدر تھے اس لیے انھوں نے کالج کے اسٹیج پر گانے کے لیے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ بعد ازاں دونوں کی ملاقاتیں عام ہونے لگیں اور اسکینڈل بنانے والوں نے دونوں کی دوستی کو جنگل میں آگ کی طرح پھیلا دیا۔ جس کے سبب ایشر کور کو بہت ملال ہوا اور وہ اداس رہنے لگی۔ اس حوالے سے اظہر جاوید لکھتے ہیں:

> محبوب بننا اور کسی مشہور، مقبول اور ہر دل عزیز ہستی کا مرکزِ نگاہ ہونا فخر کی بات ہے۔ ساحرؔ کالج میں ایک افسانوی کردار بن چکا تھا۔ نہ جانے کتنی اس کے قرب کی تمنائی ہوں گی، مگر تاریخ میں تو کسی کسی کا نام ہی آتا ہے۔ ایشر کور بھی اچھے گھرانے کی لڑکی تھی، مگر ایک نسائی حجاب تور کا وٹ بنتا ہی ہے۔ وہ ہوسٹل میں رہتی تھی اور ہم جولیوں کا ہدف بن چکی تھی، اب اس کے ساتھ ساحرؔ کا

نام جڑ چکا تھا۔ اس نے کچھ کھنچنا اور گریز کرنا شروع کیا۔ مر د اس کیفیت سے نہیں گزرتا۔ ایشر کور کے چہرے پر محبت کی بے بسی اور پانے نہ پانے کی اداسی ساحرؔ کو بھی ہلا گئی۔ [03]

ایشر کور کی اداسی ہی ساحر کی ایک نظم کا موضوع بنی۔ نظم 'کسی کو اداس دیکھ کر' کے چند مصرعے دیکھیں:

تمھیں اداس سی پاتا ہوں میں کئی دن سے
نہ جانے کون سے صدمے اٹھا رہی ہو تم
وہ شوخیاں وہ تبسم وہ قہقہے نہ رہے
ہر ایک چیز کو حسرت سے دیکھتی ہو تم
چھپا چھپا کے خموشی میں اپنی بے چینی
خود اپنے راز کی تشہیر بن گئی ہو تم

آگے چل کر ساحرؔ اس نظام پر طنز کرتے ہیں جہاں نوجوان دلوں کو محبت کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہے، بالخصوص اگر چاہنے والے ہم مذہب و ہم مسلک نہ ہوں:

مجھے تمھارے تغافل سے کیوں شکایت ہے
مری فنا مرے احساس کا تقاضا ہے
میں جانتا ہوں کہ دنیا کا خوف ہے تم کو
مجھے خبر ہے یہ دنیا عجیب دنیا ہے
یہاں حیات کے پردے میں موت پلتی ہے
شکستِ ساز کی آواز روحِ نغمہ ہے

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ساحرؔ کی زندگی میں کئی خواتین آئیں لیکن مستقل طور پر وہ کسی کے ساتھ نہ رہ سکے۔ ساحرؔ اپنی والدہ کے انتقال (1976ء) کے بعد اپنے بنگلے 'پرچھائیاں' میں ماموں زاد بہنوں انور سلطانہ اور سرور شفیع کے ساتھ رہتے تھے۔ ساحرؔ کے انتقال کے بعد اظہر جاوید کو ان کی بہنوں نے بتایا تھا کہ:

> ساحر کی فنی مقبولیت کے علاوہ ہر دور میں کوئی نہ کوئی خاتون اس کی زندگی بنی رہی۔ مجھے انور اور سرور نے بھی بتایا تھا کہ بے شمار لڑکیاں بھائی جان سے فریفتگی میں ملنے آتی رہیں اور دن بھر میں بیسیوں فون کھڑکتے رہتے تھے، لیکن نہ بھائی جان کسی کی حوصلہ افزائی کرتے تھے نہ دل توڑتے تھے۔ رکھ رکھاؤ کے ساتھ ایک فاصلہ قائم رکھتے تھے۔ ان بہنوں نے یہ بھی کہا کہ ہم آپ کو پورے وثوق سے بتا سکتی ہیں کہ بھائی جان کی زندگی میں کوئی بداعتدالی نہیں تھی۔ البتہ اپنی امی کی وفات کے بعد ان کی شراب نوشی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ [04]

ساحر لدھیانوی اور امرتا پریتم کی داستانِ محبت اظہر من الشمس ہے۔ حالاں کہ ساحرؔ نے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا ہے لیکن امرتا پریتم نے اپنی خود نوشت 'رسیدی ٹکٹ' (1976ء) میں شادی شدہ ہونے کے باوجود لاہور کے قیام کے دوران ساحرؔ سے اپنی محبت کا بے محابا اظہار کیا ہے۔ جب کہ اظہر جاوید نے لکھا ہے:

> امرتاؔ نے ساحر کے نام کو کیش (Cash) کروایا تھا۔ [05]

لیکن یہ الزام دور از قیاس ہے کیوں کہ امرتا، ساحرؔ سے سینئر تھیں، خوبصورت و خوشحال تھیں اور بطور

مصنفہ پنجابی ادب میں اپنا مقام بنا چکی تھیں، جب کہ ساحرؔ لاہور میں ابھی قدم ہی جما رہے تھے۔
ساحرؔ اور امرتا کی تعارفی ملاقات 'پریت نگر' میں ہوئی تھی جو پنجاب کے روشن خیال ادیبوں اور فنکاروں کا کمیون (Commune) تھا۔ اس ادارے سے ساحرؔ کا مقبول عام مجموعہ 'تلخیاں' (1944ء) شائع ہوا تھا اور یہیں سے ایک رسالہ 'پریت لڑی' کے نام سے اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوا کرتا تھا۔ ساحرؔ نے کچھ عرصہ اس رسالے کی ادارت بھی کی۔ دراصل ساحرؔ امرتا کی پنجابی نظمیں ترجمہ کر کے اپنے رسالے 'ادبِ لطیف' میں تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع کرتے تھے۔ امرتا کی شخصیت بھی بڑی دلکش تھی۔ ایک تو وہ بے حد حسین، بلونت سنگھ کے الفاظ میں 'ڈبل ڈوز سکھنی' تھیں۔ وہ شاعری بھی اچھی کرتی تھیں۔ ان کے فن اور شخصیت کے پرستاروں میں ساحرؔ بھی شامل تھے۔ ساحرؔ کی نظم 'ایک تصویر رنگ' اسی محبت کی نشانی ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً امرتا سے ملنے لاہور میں ان کے گھر جایا کرتے تھے اور ان کی گورمکھی میں لکھی ہوئی نظموں کو لے آتے، پھر کسی گورمکھی جاننے والے کو ڈھونڈتے اور اردو میں ترجمہ کرواکر نہ صرف اپنے رسالے میں شائع کرتے بلکہ اردو کے دوسرے رسائل میں بھی چھپوانے کی سفارشیں کرتے۔ تقسیم کے بعد امرتا دلی چلی آئیں۔ ساحرؔ بھی 1948ء میں روزگار حاصل کرنے کی غرض سے لاہور سے دلی منتقل ہو گئے اور کچھ عرصہ دلی میں مقیم رہے۔ دلی میں وہ یوسف جامعی کے ادارے حالی پبلیشنگ ہاؤس سے وابستہ ہوئے اور یہیں سے انھوں نے ترقی پسند ماہنامہ 'شاہراہ' جاری کیا۔ ساحرؔ جب تک دلی میں مقیم رہے، امرتا پریتم سے ان کے گہرے مراسم قائم رہے۔ امرتا کی دیوانگی کی حد یہ تھی کہ جب ساحرؔ ان کے گھر آدھے جلے ہوئے سگریٹ چھوڑ جاتے تو وہ انھیں دوبارہ جلا کر پیتی تھیں۔ اس دیوانگی کی کیفیت جنون جیسی ہو گئی تھی۔ اس کا اندازہ ان کی خود نوشت میں شامل اس واقعے سے بخوبی ہو جاتا ہے:

> ایک دن ساحر آیا تو اسے ہلکا سا بخار چڑھا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں درد تھا، سانس میں کھنچاؤ کی سی کیفیت تھی۔ اُس دن اس کے گلے اور چھاتی پر میں نے وِکس ملی تھی۔ کتنی ہی دیر تک ملتی رہی تھی اور تب مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں اس طرح پیروں پر کھڑے کھڑے پوروں سے، انگلیوں سے اور ہتھیلیوں سے اس کی چھاتی کو ہولے ہولے ملتے ہوئے تمام عمر گزار سکتی ہوں۔[06]

جب امرتا حاملہ تھیں تو ان کو ایک اور جنون یہ ہوا کہ ساحرؔ کا تصور کرتی رہتی تھیں تاکہ ان کا بچہ ساحرؔ کی شکل کا ہو۔ وہ ساحر کو نہ صرف پسند کرتیں بلکہ اسے اپنا آئیڈیل مانتی تھیں۔ انھوں نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے:

> ساحر اوروں کے لیے محض ایک شاعر تھا لیکن میرے لیے ایک آئیڈیل کا درجہ رکھتا تھا۔[07]

یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے 'نوراج' کو بھی ایک آئیڈیل کے روپ میں ابھرتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھیں۔ امرتا کے اس خواب کی تعبیر سچ ہو گئی۔ ان کے بیٹے نوراج کی شکل واقعی ساحرؔ سے مشابہ تھی۔ اس بات کا ذکر امرتا نے 'رسیدی ٹکٹ' میں کیا ہے:

> نوراج بالکل ساحرؔ کا ہم شکل ہے۔ ایک بار خود میرے بیٹے نے مجھ سے یہ سوال کیا تو میں نے اسے بتایا، عورت جب حاملہ ہو تو بچے کی تشکیل کے وقت وہ جس ہستی کا سب سے زیادہ تصور کرتی ہے یا اس کی تصویر دیکھتی رہتی ہے، ہونے والا بچہ اسی شکل کا ہوتا ہے۔ میں نے نوراج اپنے بیٹے کو کہا: ''تمھاری پیدائش کے وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا'' تب نوراج نے بڑی معصومیت اور بے ساختگی سے کہا تھا: ''ماں، اگر میں ساحر انکل کا بیٹا بھی ہوتا تو کوئی بات نہیں، میں انھیں بے حد پسند کرتا ہوں۔[08]

لیکن بعض لوگ امرتا پریتم کے اس دعوے کو غیر عقلی تسلیم کرتے ہیں۔ اظہر جاوید نے بھی اس بات پر اعتراض کیا ہے اور لکھا تھا کہ :

> ہندو، سکھ اور عیسائی عورتیں امید کے دنوں میں مہاراج کرشن، گورونانک، اور یسوع مسیح کی تصویر کو ہر دم دیکھتی رہتی ہیں، پھر آج تک کوئی ان کا ہم شکل کیوں پیدا نہ ہوا؟ مسلمان عورتیں بھی گھر میں خوبصورت بچوں کے پوسٹر لٹکائے رکھتی ہیں لیکن اکثر کالے بھجنگ بچے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ میں بے شمار لوگوں سے اس مسئلے پر گفتگو کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی جذباتی لمحوں میں ساحر اور امرتا کا وصل تو ہوا ہوگا۔ امرتا اپنے جسم و جاں کی وجہ سے زیادہ Demanding رہی ہوں گی۔ بچے کی پیدائش کا عمل تو بہت مختصر ملاپ میں بھی ہو جاتا ہے۔[09]

اس مفروضے کی حقیقت امرتا اور ساحر ہی بتا سکتے تھے لیکن یہ راز وہ اپنے ساتھ دوسری دنیا میں لے گئے۔

ساحرؔ نے 1950ء میں مستقل طور پر دہلی چھوڑ کر بمبئی سکونت اختیار کر لی اور تمام تر توجہ فلمی کریئر میں لگا دی تھی۔ بمبئی کے ابتدائی دنوں میں ساحرؔ، کرشن چندر کے گھر رہے۔ انھوں نے ساحر کی فلمی دنیا میں کامیابی میں اہم رول ادا کیا۔ ساحرؔ نے اپنی تخلیقیت اور ترقی پسند نظریے کا اظہار فلمی گیتوں میں کیا۔ انھوں نے اپنے سماجی و سیاسی افکار کو بے حد سلیقے سے فلمی گیتوں کی شکل عطا کی۔ ساحرؔ نے فلمی شاعری کے معیار کو عظمت بخشی۔ فلمی دنیا میں ساحرؔ کی ملاقات معروف گلوکارہ لتا منگیشکر سے ہوئی۔ لتا منگیشکر نے ساحرؔ کے لکھے ہوئے بہت سے گیتوں کو اپنی سریلی آواز دی ہے۔ انھوں نے لتا کے لیے 'تیری آواز' کے عنوان سے ایک نظم بھی لکھی جو پرکاش پنڈت کی ادارت میں دہلی سے شائع ہونے والے رسالے 'فنکار' میں شائع ہوئی تھی :

یوں اچانک تری آواز کہیں سے آئی
جیسے پربت کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے
یا زمینوں کی محبت میں تڑپ کر ناگاہ
آسمانوں سے کوئی شوخ ستارہ ٹوٹے
شہد سا گھل گیا تلخابۂ تنہائی میں
رنگ سا پھیل گیا دل کے سیہ خانے میں
دیر تک یوں تری مستانہ صدائیں گونجیں
جس طرح پھول چٹکنے لگیں ویرانے میں

ساحرؔ کی نظم 'انتظار' بھی اسی دور کی یادگار کہی جاتی ہے، جس کا پہلا شعر ہے :

چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

اس نظم کو فلم میں بھی استعمال کیا گیا ہے جسے بے پناہ مقبولیت ملی۔ تاہم فلموں میں کامیابی کے بعد ساحرؔ کی انا بلند ہونے لگی تو بھولی بھالی اور معمولی شکل و صورت کی فنکارہ لتا منگیشکر سے ان کے اختلافات اس قدر بڑھ گئے کہ دونوں کو الگ ہونا پڑا۔ اس کے بعد ساحرؔ نے کم عمر اور خوبصورت پنجابی گلوکارہ سدھا ملھوترا کو پروموٹ کرنا شروع کر دیا۔ ان کے رومانوی تعلقات کے قصے عام ہونے لگے۔ سدھا کی آواز میں لتا جیسا جادو تو نہیں تھا تاہم کچھ اچھے نغمے

انھوں نے اس دور میں ضرور گائے۔ خصوصاً ساحرؔ کا لکھا ہوا نغمہ :

تم مجھے بھول بھی جاؤ تو یہ حق ہے تم کو
میری بات اور ہے میں نے تو محبت کی ہے

مخمور سعیدی نے اس موضوع پر لکھا تھا:

سدھا ملھوترا اور ساحرؔ کا عشق اخباری سرخیوں کی بھی زینت بنا اور ادبی و فلمی حلقوں میں مہینوں تک اس کے چرچے رہے۔[10]

لیکن ساحرؔ کا یہ عشق بھی ناکام رہا۔ سدھا کی منگنی بزنس مین گردھر موٹوانی کے ساتھ ہوگئی۔ ساحرؔ، سدھا کی منگنی میں شریک ہوئے اور بھری محفل میں اپنی مشہور نظم سنائی:

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دل نوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں میں
نہ ظاہر ہو تمھاری کشمکش کا راز نظروں سے
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

اور یہیں پر سدھا اور ساحر کے عشق کا قصہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

ساحرؔ کے دوست حمید اختر نے اپنی کتاب 'آشنائیاں کیا کیا' میں ساحر کے خاکے میں ساحرؔ کے ساتھ افسانہ نگار ہاجرہ مسرور کی منگنی کا ذکر کیا ہے:

جب ہم سب لوگ بمبئی میں تھے تو ہاجرہ مسرور بھی وہیں تھیں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں باقاعدہ شرکت کرتی تھیں۔ وہیں دونوں کی منگنی ہوئی تھی جو ٹوٹ بھی گئی۔[11]

اس کے علاوہ حیدرآباد دکن میں ایک شادی شدہ عورت ساحرؔ پر فریفتہ ہوگئی تھی۔ حالاں کہ وہ خاتون ایک بچے کی ماں تھی لیکن ساحرؔ جب بھی کسی مشاعرے یا کانفرنس میں سردار جعفری کے ساتھ حیدرآباد جاتے تو وہ خاتون ان سے ملنے آتی اور اپنے شوہر سے طلاق لے کر ان سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اظہر جاوید نے لکھا ہے کہ یہ قصہ ان کو سردار جعفری اور ان کی بیگم سلطانہ جعفری نے سنایا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس عورت کے شوہر نے بھی اس کو ساحرؔ سے شادی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ انجام یہ ہوا کہ دونوں میاں بیوی اگلے روز نکاح پڑھوانے تک کا وعدہ کر گئے تھے مگر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ نہیں آئے اور ساحرؔ نامراد واپس بمبئی لوٹ آئے۔

ساحرؔ لدھیانوی نے جس دور میں شاعری اور سیاسی ایکٹیوزم شروع کیا، وہ انگریزوں کی غلامی کے خلاف جدوجہد کے ساتھ ساتھ سماج میں اندھ وشواس، چھوا چھوت، فرقہ واریت اور خواتین کے ساتھ جاری صدیوں سے عدم مساوات کے رویّوں کے خلاف آواز اٹھانے کا دور تھا۔ جہاں تک خواتین کے حقوق کی بحالی کا سوال تھا تو مجازؔ ہندوستانی عورت کو پرچم اٹھانے کی تلقین ساحرؔ سے پہلے ہی کر چکے تھے اور عورتوں کی احتجاجی آواز کو تقویت پہنچانے کے لیے نذر سجاد حیدر، رشید جہاں اور عصمت چغتائی وغیرہ سب لگاتار فکشن لکھ رہے تھے۔ ساحرؔ نے اپنی نظموں میں اسی ایجنڈے کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے بلکہ عورتوں کے استحصال اور ان پر روزمرہ کی زندگی میں ہونے والے

مظالم کے خلاف آواز تو بلند کی لیکن ذاتی زندگی میں عورت کے حوالے سے وہ نہ تو مستقل مزاج نظر آتے ہیں اور نہ ہی اسے اپنی زندگی میں وہ مقام دیتے ہیں جس کی وہ مستحق ہیں۔

ساحرؔ کی ذاتی زندگی میں یکے بعد دیگرے آنے والی خواتین کے بارے میں ان کا رویہ نہایت مایوس کن اور مجہول رہا۔ امرتا پریتم شادی شدہ تھیں لیکن ہاجرہ مسرور، پریم چودھری، ایشر کور، لتا منگیشکر اور سدھا ملھوترا تو غیر شادی شدہ تھیں، بالخصوص سدھا تو نہایت خوبصورت اور پرکشش آواز کی مالک بھی تھیں۔ نہ معلوم ساحرؔ ان خواتین کو شریک زندگی کیوں نہ بنا سکے اور ان کے جذبات سے کھیل کر کنارہ کش ہوتے گئے۔ ساحرؔ کو اپنی مظلوم ماں سردار بیگم سے عقیدت کی حد تک محبت تھی لیکن ماں تو ساحرؔ کی زندگی کو آباد دیکھنا چاہتی ہے۔ پھر بھی ساحر تمام زندگی اپنے نزدیک آنے والی خواتین کو اپنانے سے گریز کرتے رہے۔ ماں سے اس قدر عقیدت و محبت رکھنے والا دوسری عورتوں کے تئیں اس طرح کا رویہ کیوں رکھ رہا تھا۔ حالانکہ ساحرؔ کی نظمیں اس امر کی شاہد ہیں کہ وہ عورت کے تئیں ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے، ہندوستانی معاشرے میں انھیں عزت و عظمت کا درجہ دینا چاہتے تھے اور پدر شاہی نظام میں عورتوں کو مردوں کے برابر/مساوی طور پر دیکھنے کے خواہاں ہیں لیکن وہ اپنی ذاتی زندگی میں عملی طور پر ایسا نہیں کر سکے۔ یہ نہ صرف غور و فکر کا مقام معلوم ہوتا ہے بلکہ غیر فطری بھی دکھائی دیتا ہے۔ ساحرؔ کے اس غیر فطری طرزِ فکر کی نفسیاتی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن مغربی ممالک کی طرح اردو میں ادیبوں اور شاعروں کے میڈیکل ریکارڈ دستیاب نہیں ہیں۔ حالانکہ فیض احمد فیض کا میڈیکل ریکارڈ ڈاکٹر تقی احمد عابدی نے مرتب کیا ہے اور ڈاکٹر عبدالجلیل نے غالب کے امراض پر لکھا تھا۔ بمبئی کے ڈاکٹر کپور، ساحرؔ کے معالج تھے، جن سے ساحرؔ نے اپنی وفات بروز 25 اکتوبر 1980ء کو کہا تھا کہ ''ڈاکٹر کپور، میں مرنا نہیں چاہتا۔'' اس معالجے کی تفصیل جاننے کے لیے ان کا معالجاتی گوشوارہ بھی دستیاب نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں یہ کہنا مشکل ہے کہ ساحرؔ کے ذہنی و نفسیاتی مسائل کیا تھے اور وہ اپنی نزدیکی خواتین سے کنارہ کشی کیوں اختیار کر لیتے تھے۔ کیا وہ نفسیاتی طور پر ناکام انسان تھے یا عملی طور پر؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب تلاش کیے جانے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات

01- حافظ لدھیانوی، رومان اور انقلاب کا شاعر، مضمون مشمولہ فن اور شخصیت، ساحر لدھیانوی نمبر، بمبئی، صفحہ 132
02- بلونت سنگھ، ہم کہ ٹھہرے اجنبی، انٹرویو مشمولہ فن اور شخصیت، ساحر لدھیانوی نمبر، بمبئی، صفحہ 47
03- اظہر جاوید، ناکام محبت: ساحر لدھیانوی، دہلی، صفحہ 56
04- اظہر جاوید، ناکام محبت: ساحر لدھیانوی، صفحہ 44
05- اظہر جاوید، ناکام محبت: ساحر لدھیانوی، صفحہ 63
06- امرتا پریتم، رسیدی ٹکٹ، صفحہ 39
07- امرتا پریتم، رسیدی ٹکٹ، صفحہ 18
08- ایضاً
09- اظہر جاوید، ناکام محبت: ساحر لدھیانوی، صفحہ 63
10- ساحر لدھیانوی ایک مطالعہ، مرتب مخمور سعیدی، صفحہ 28
11- بحوالہ اظہر جاوید، ناکام محبت: ساحر لدھیانوی، صفحہ 61

ڈاکٹر افتخار الحق

ادب اور سیاست

ہمارا ملک ترقی پذیر ممالک کے اس گروہ میں شمار ہوتا ہے جہاں سیاسی عدم استحکام اور غیر یقینی کی کیفیت سکہ رائج الوقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے جہاں عام شہری براہِ راست متاثر ہوتا ہے وہیں اہلِ قلم زیادہ حساس اور ذمہ دار ہونے کے ناطے ایسی صورت حال کا نہ صرف مشاہدہ کرتے ہیں بلکہ تجزیاتی مطالعے کے بعد اس کا ممکنہ حل پیش کریں یا نہ کریں، کم از کم مثبت طرزِ فکر کو فروغ دینے کی سعیِ بسیار بہر طور کرتے ہیں۔ اس سیاسی عنصر اور اس سے جُڑے ردِ عمل کے سبب مزاحمتی اور علامتی طرزِ تحریر نے جنم لیا۔ مزاحمتی ادب میں حبیب جالب جیسے شعرا براہِ راست سیاسی منظر نامے سے پروان چڑھنے والی سماجی عدم مساوات اور قوت کے استعمال کے خلاف بانگ دہل بولتے اور لکھتے ہیں جبکہ فیضؔ جیسے قد آور شاعر قدرے براہِ راست لکھنے کے ساتھ ساتھ علامتی/استعاراتی طرزِ اظہار بھی اپناتے ہیں۔ مثلاً فیضؔ نے تقسیمِ ہند سے جُڑے فسادات اور پھر سقوطِ ڈھاکہ جیسے المیوں پر متاثر کن شاعری کی، جسے بہت پذیرائی ملی۔ یہاں میں پوری مثالیں دینے کی بجائے مختصر اقتباسی ٹکڑے پیش کرنے کو ترجیح دوں گا کیونکہ ان اشعار کو تواتر سے اتنی بار پیش کیا جا چکا ہے کہ مجھے انھیں پھر سے لکھنا کلیشے نما بات لگے گی۔

حبیب جالب کے مشہور اشعار ''میں نہیں مانتا۔۔۔'' اور فیض کی ۱۹۴۷ء کے تناظر میں ''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر۔۔۔'' اور ۱۹۷۱ء کے المیے کی بابت ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی۔۔۔۔'' اس ضمن میں آفاقی شہرت کے مرتبے پر فائز ہیں۔ نثر میں انتظار حسین اور مرزا حامد بیگ سمیت کئی نمایاں اسمائے گرامی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ادیب یا شاعر کی ایسے حالات میں اور کیا ذمے داری ہو سکتی ہے کیونکہ بیشتر نظری اور منظوم تخلیقات میں مسائل اور سانحات کا بیان تو ہوتا ہے لیکن ان کے ممکنہ حل کی طرف کم کم ہی اشارہ ملتا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ کیا ہماری کوئی تاریخی/سیاسی مجبوریاں ہیں یا اہلِ قلم کے سامنے کوئی نمونے/مثالیں نہ ہونے کے باعث ایسا کرنے سے تذبذب پایا جاتا ہے؟ میرے خیال میں یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس کا تجزیہ کرنے میں تاریخی اور زمینی حقائق کی تفصیل میری اس تحریر کو ادب کے میدان کے گرداگرد کھنچی حدِ فاصل سے نکال کر صحافتی یا تدریسی اکھاڑے میں لے جائے گی۔

اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کے اپنے اپنے اندرونی مسائل ہوتے ہیں جن کا اپنا مخصوص پس منظر ہوتا ہے۔ پھر اگر ادبا اور شعرا براہِ راست ایسے مسائل میں ''مبنی بر آرا'' تخلیقات منظرِ عام پر لانے لگ جائیں تو پھر وہی ادب برائے ادب اور ادب برائے مقصد کی بحث کا گڑا مردہ اکھڑنے کا شدید احتمال ہو گا۔ لٰہذا میری رائے میں زیادہ باشعور اور پختہ لکھاری علامتی/استعاراتی/رمزیہ رنگ میں ادبی جمالیات کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے ''کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے'' کی حکمتِ عملی کو مشاقی سے بروئے قلم لاتے ہوئے ہمیں شہکار تخلیقات دے

جاتے ہیں۔ ایک بڑے لکھاری کی پہچان یہی ہے کہ اسے اظہار کی متعدد جہات پر پورا عبور ہوتا ہے اور وہ سیاسی موضوعات پر لکھتے ہوئے شعوری/لاشعوری طور پر کہیں نہ کہیں متعلقہ مسائل کے مضمرات یاانکے حل کی بابت بھی بہت کچھ کہہ جاتے ہیں، بصورتِ دگرادب اور صحافت کے درمیان لگائی گئی باریک مگر واضح لکیر کے آر پار جانے والی بات ہو جائے گی۔ گویا زیادہ بڑا لکھاری چلمن سے لگے بیٹھنے والی پالیسی ارادتاً یانادانستگی میں اپنائے رکھتا ہے۔ نادانستہ اس لیے لکھا کہ ایسے اہلِ قلم تخلیقی ارتقا کی اتنی سیڑھیاں چڑھ چکے ہوتے ہیں کہ اپنا مخصوص اسلوب ایجاد کرتے ہوئے وہ ایسے امور کا خیال ہی نہیں رکھتے۔

ویسے ادب بقول میتھیو آرنلڈ زندگی پر تنقید کا نام ہے۔ سو ایک ادیب/شاعر ثقافت، سماجیات، معاشیات، تاریخ اور سیاست کا ادراک بہر طور رکھتا ہے اور ان سب موضوعات پر لکھنے میں آزاد ہوتا ہے یا ان میں سے چنیدہ موضوعات پر قلم اٹھانے کو ترجیح دیتا ہے۔ اگر ہم گزشتہ چند صدیوں میں سیاست پر قلم اٹھانے والے ادبا/شعرا پر نظر ڈالیں تو ہمیں معدودے اسمائے گرامی ہی ملیں گے: شاعری میں اقبال، حالی اور حفیظ جالندھری جبکہ نثر میں سر سید اور ان کے رفقا و ہم خیال اہلِ قلم۔

علامہ اقبال کا شعوری طور پر منتخب کردہ موضوع مسلم امت کا اتحاد اور استعماری قوتوں کے خلاف احتجاج تھا جسے انھوں نے باقاعدہ مطالعے اور مشاہدے کے بعد چنا اور پھر اس پر خوب لکھا۔ اس بابت ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے مقابلے میں ٹیگور کو نوبیل پرائز اس لیے دیا گیا کہ موخر الذّکر نے دینی موضوعات پر نہیں لکھا تھا۔ گویا یہاں الٹا معاملہ ہو گیا کہ سیاست بذاتِ خود ادب میں در آئی۔ شاید یہ بھی اپنی جگہ ایک دلچسپ موضوع کی حیثیت رکھتا ہو اور اس پر لکھنا بھی اہم ہو۔ اقبال کے کچھ ہم عصروں نے اقبال کی پیروی کرنے کی کاوش کی جیسے مولانا ظفر علی خان وغیرہ۔ یہاں ضمناً گزارش کر دوں کہ اس زمانے میں بیشتر صحافیوں کے نام سے پہلے مولانا لکھنا عام رواج تھا۔ مولانا ظفر علی خان نے پیرویِ اقبال نیک نیتی سے کی تھی لیکن وہ اقبال جیسے تناور درخت کے سائے میں پل کر اتنا ابھر نہیں پائے۔ اقبال سے کچھ پہلے حالی نے ''مسدس حالی''/''مدّو جزرِ اسلام'' اور اقبال سے کچھ بعد حفیظ جالندھری نے ''شاہنامۂ اسلام'' لکھ کر اپنا سکہ جما لیا تھا۔ یہ استثنائی مثالیں ہیں کیونکہ حالی دبستانِ سر سید سے وابستگی کے باعث مقصدی ادب کے قائل تھے جبکہ حفیظ جالندھری نے تقسیمِ ہند کے پس منظر اور عمل کو باقاعدہ دیکھا اور اس سے کافی تحریک لی۔ پھر یہ کہ ان کے قلمی معرکے کا موضوع قدرے مختلف تھا کہ انھوں نے نعتیہ رنگ میں زمانہ قبل از اسلام سے لے کر رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور غزوات کو منظوم کیا۔ علامہ اقبال کے بعد ایسا کوئی قابلِ ذکر شاعر نہیں ملتا جس نے اتنی تفصیل سے عالمِ اسلام کے مسائل اور اتحادِ امت کے خواب کو منظوم کیا ہو۔ اتفاق سے نثری شعبے میں بھی ایسا ہی ہے کیونکہ دبستانِ سر سید نے کافی مدافعتی بلکہ کسی حد تک خوشامدانہ انداز میں ادبی تحریک چلائی۔ سر سید اور ان کے ہم خیال لکھاریوں نے مسلمانانِ ہند کو برطانوی نوآبادیاتی نظام کو مودبانہ قبول کرنے پر زور دیا اور کسی بھی قسم کی مزاحمت وغیرہ پر کبھی نہیں اکسایا۔ سر سید اور انکے رفقا کے طرزِ عمل سے اختلاف کی گنجائش کے باوجود ان کی نیک نیتی پر شک کا کوئی جواز نہیں بنتا کہ جنگِ آزادی کے بعد ہند کے مسلمانوں کے ساتھ فرنگیوں نے جو کچھ کر دیا تھا اس کے بعد شاید کوئی اور حکمتِ عملی ممکن ہی نہ تھی۔ البتہ ساحر لدھیانوی نے کسی حد تک سیاست و تاریخ کے کچھ گوشوں پر نظمیں وغیرہ لکھ کر مناسب شہرت کمائی۔ ساحر نے مغلوں کی شان و شوکت اور عیاشانہ رویے پر طنز

کرتے ہوئے شاہ جہاں کے تعمیر کردہ تاج محل پر ایک طنزیہ نظم لکھ کر بہت مقبولیت حاصل کی۔ اسی طرح سیاسی سرپرستی میں پلنے والے ادارے کو نظم ''چکلے''میں کافی جرات سے ابھارااور ایسی نظموں کی پذیرائی ان کا مقدر بنی۔

اقبال اور سرسید کے بعد ان جیسے ادبی قد و قامت والے لکھاریوں کا نہ ہونا جہاں ان کی عظمت کی دلیل ہے وہیں یہ اردو ادب میں قحط الرّجال کی غماز بھی ہے۔ دیکھنا ہو گا کہ ایسے قد آور اہلِ قلم یا ان جیسا دبستانِ فکر تشکیل پانے کے کتنے امکانات ہیں اور ان کی کامیابی / مقبولیت کا تعین کون کرے گا؟

افسانے

ذکیہ مشہدی

گڑیا

وہ گھر سے چلی تو جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ ٹرین رات کے نو بجے تھی جیسا کہ ان لوگوں نے بتایا تھا۔ ٹرین کیا ہوتی ہے یہ وہ جانتی تھی۔ ایک دو ریل گاڑیاں اس کے گاؤں کے کنارے کنارے گنے اور ارہر کے کھیتوں کے پاس سے گزرا کرتی تھیں۔ وہ کہاں سے آتی ہیں اور کہاں جاتی ہیں اس پر اس نے کبھی غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ کبھی کسی ٹرین سے سفر کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اللہ میاں کے پچھواڑے والے اس گاؤں میں اس کا کچا، پھوس کے چھپر والا گھر ایسی جگہ تھا جہاں سے بس اسٹینڈ تک جانے کے لئے بھی کوئی سواری نہیں تھی۔ کچھ دور پیدل چلنا تھا پھر بس پر چڑھ کر وہاں پہنچنا تھا جہاں سے ٹرین پکڑی جاسکتی تھی۔ وہ بس پر چڑھی تھی اور بس اڈا گھر سے اتنا قریب تھا کہ وہاں کئی مرتبہ یوں بھی جانکلتی تھی۔ وہاں ایک بڑا سا تالاب تھا جس میں لوگ بھینسوں کو نہلاتے اور پاس کھڑے تاڑ کے درختوں سے تاڑی اتارتے۔ بھینسیں اور بطخیں اور سور ادھر ادھر منہ مارتے رہتے۔ درمیان میں کٹ کٹ کٹاک کرتی مرغیاں گھس آتیں، بکریاں دراندازی کرتیں۔ کوئی کسی کو کچھ نہ کہتا۔ اسے کبھی یہ نہیں محسوس ہوا تھا کہ اس کی زندگی میں ان چیزوں کی کوئی اہمیت ہے۔ وہ تو بس وہاں تھیں، ہمیشہ سے تھیں جیسے کھیت کھلیان، اڑوس پڑوس، ہوا پانی، اماں ابا، بھائی بہن، نشیڑی ماموں۔ آج دونوں چھوٹے بھائی اور ایک بہن آکر اغل بغل کھڑے ہو گئے۔ شاید جھلنگے پلنگ پر پڑی چھ مہینے کی بہن نے بھی کروٹ بدلی اور کالا دھاگا بندھی سوکھی ٹانگ سے ہوا میں لات چلائی۔ اماں کہتی تھی کالا دھاگا باندھنے سے نظر نہیں لگتی۔ اس سوکھی کالی، زور سے رونے کی بھی طاقت نہ رکھنے والی بچی کو کس کی نظر لگنے والی تھی؟

ویسے وہ دونوں جو اس کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتے چل رہے تھے اسے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ ان کے پاس سے خوشبو بھی آرہی تھی۔ ایسی خوشبو مولسری کے درخت کے نیچے آیا کرتی تھی یا جب کچے احاطے میں لگی رات کی رانی مہکتی یا ہار سنگھار نے ہنس ہنس کے پھول جھاڑے ہوتے۔ انسانوں کے پاس سے ایسی خوشبوئیں کہاں آتی تھیں۔ کیا ان خوشبودار لوگوں کے گھر رات کی رانی مہکتی ہو گی؟ کیا وہاں مولسری کا درخت ہو گا؟ کیا ہار سنگھار وہاں بھی ہنس ہنس کر اپنے ننھے ننھے ستاروں جیسے سفید پھول جھاڑتا ہو گا جن کی نازک ڈنڈیاں بطخ کی چونچ جیسے گہرے نارنجی رنگ کی ہوتی ہیں کیا۔

وہاں بھی تالاب ہو گا اور اس کے کنارے وہ گندے بدہیئت سور ہوں گے جن کی وجہ سے ابا کے اپنے بچوں کو غصے میں سور کا بچہ کہنے پر اسے بے حد غصہ آتا۔ (گالیاں دیتے ابا اسے بہت برے لگا کرتے تھے لیکن ابھی خاموش، کنارے کھڑے ابا پر اسے بڑا ترس آیا) یہ چشم زدن میں زندگیاں یوں کیسے بدل جایا کرتی ہیں (ایسا سوچنے کے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے لیکن سوچ تو الفاظ کی پابند نہیں ہوتی ورنہ گونگے بہرے کبھی کچھ نہ سوچ پاتے) اس نے

جاتے جاتے پلٹ کر ایک نظر اپنی محبوب بکری پر ڈالی جو کھونٹے سے بندھی بیٹھی مزے سے جگالی کر رہی تھی۔ دونوں بچے پاس ہی پھدک رہے تھے اور بکری کے دودھ سے بھرے تھن زمین پر لوٹ رہے تھے۔ اس کا جی چاہا ایک بار پاس جا کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے الوداع کہہ کر آئے۔

بس چلی تو سارا کچھ پیچھے چھوٹنے لگا۔ تاڑی پی کر اماں کی اکلوتی چیز چاندی کی پائل، چرانے والے ماموں اور ہوا پی کر نشہ کرنے والے جھومتے تاڑ کے درخت، کھیت کھلیان، تالاب، ڈھٹائی سے راستے میں کھڑی گائیں، امرتی ساؤ کی دوکان پر جلتی ڈھبری اور بلا وجہ بھونکتے کتے، اور جب ٹرین چلی تو جو پیچھے چھوٹ رہا تھا اس کے چھوٹنے کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ ہاں چاند اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور وہ ستارہ بھی جو اس کے گھر کے ٹھکوا اوپر سے جھانکا کرتا تھا۔ کیا یہ اس کے ساتھ ساتھ پٹنہ شہر تک جائیں گے؟ ان لوگوں کے گھر سے بھی دکھائی دیں گے؟

اماں نے کہا تھا ان لوگوں کو بھیا، بھابھی کہنا۔ انہوں نے اسے کھانا کھلایا پھر اس کا بستر بچھا دیا۔ ٹرین الگ جھولا جھلا رہی تھی۔ پہلے اسے لگ رہا تھا آج کی رات بہت بھاری ہے لیکن ایسی نیند آئی کہ صبح جھنجھوڑ کر جگایا گیا۔ اسٹیشن، گھر، گرد و پیش دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ تلاؤ کی مچھی کو کسی نے اچھال کر گنگا میں ڈال دیا تھا۔

گھر میں ایک بڑی شفیق بزرگ عورت تھیں۔ جنہیں لوگ اماں کہتے تھے۔ یہ دونوں تھے جو اسے لائے تھے۔ اماں کے بیٹا، بہو، دو چھوٹے لڑکے تھے۔ ایک پانچ برس کا اور دوسرا کوئی ڈھائی تین سال کا۔ بچے ایسے خوبصورت، صحتمند اور خوش و خرم لیکن اس کے ذخیرۂ الفاظ میں صحتمند اور خوش و خرم جیسے الفاظ تھے ہی نہیں۔

سب لوگ روز نہا دھو کر کپڑے بدلا کرتے تھے۔ اتنے کپڑے؟ اسے بھی تو ایک ساتھ دو جوڑے دیے گئے اور ایک جوڑ کپڑے بھابھی یہاں سے لے کر بھی گئی تھیں جو اسے پہنا کر لائی تھیں۔ اس کا کثیف، پرانا جوڑا وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ نئے چپل، بالوں کے لیے ربن۔ اسے ایک چھوٹا بکس دیا گیا۔ اس میں سارا سامان تھا۔ یہ ہمارا ہے؟ وہ ہکلائی تھی۔ بہت دیر لگا کر اسے یقین ہوا کہ یہ چیزیں اسی کی ہیں۔

سب اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کر رہے تھے۔ بس موٹی ملازمہ جو صبح شام آ کر جھاڑو بہارو کرتی اور کھانا پکاتی، کچھ ٹیڑھی سی رہا کرتی تھی۔ پہلے دن بھی اس نے کہا تھا:

''اے چھوکری، خالی بیل جیسی آنکھوں سے تاکے ہے کہ کچھ کام دھام بھی جانے ہے۔'' اس پر ان بزرگ خاتون نے تنبیہ کی تھی:

''سیکھ لے گی سیکھ لے گی۔ اور کام ہے بھی کیا۔ دونوں بچوں کو ہی تو سنبھالنا ہے۔''

کئی دن گزر جانے کے بعد بھی وہ اس سارے کارخانے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے یوں دیکھتی رہتی تھی جیسے ان میں سارے جہاں کی حیرت سمٹ آئی ہو۔ ایک دن وہاں ان بچوں کے ماموں آئے۔ ان کو بھی وہ دیر تک گھورتی رہی۔

ماموں کہیں ایسے بھی ہوتے ہیں عمدہ پینٹ شرٹ میں ملبوس، ہنس مکھ، بچوں کے لئے بہت سے چاکلیٹ لانے والے ماموں کیا اپنی بہن کا زیور چرائیں گے؟

''ارے یہ کہاں سے مل گئی۔'' انہوں نے بزرگ خاتون سے کہا۔ انھیں وہ اماں کہہ رہے تھے۔

''دکشن گنج والی غریب رشتہ داروں کی لڑکی ہے۔ ان کے یہاں ضرورت نہیں تھی۔ یہاں رکھوا دیا۔''

''ارے تو ایک ہمیں بھی دلوا دیں۔''

''لو بھلا۔ بازار میں بک رہی ہیں کیا۔''

''اس کی کوئی بہن نہیں ہے؟''

''ہے تو لیکن ماں باپ اب دیں گے نہیں۔ لڑکی کو باہر بھیجنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ کشن گنج والی پر انھیں پورا بھروسہ تھا اس لیے بھیج دیا۔''

''اماں، آپ ہمارا خیال نہیں کر رہیں۔''

''میاں پہلے اپنا خیال۔ اس عمر میں دو بچے تنہا ہم پال رہے تھے۔ دلہن بیگم دن بھر نوکری پہ۔ اپنے بچوں کو پال پوس کے بڑا کر دیا تھا۔ اب بڑھاپا خراب۔''

''ارے تم اپنی بہن کو بلا سکتی ہو؟'' انھوں نے براہ راست اس سے سوال کیا۔ وہ تکتی رہی۔

''ایسے ہی تاکے ہے ٹکر ٹکر۔ کوئی کام تھوڑی کرے ہے۔ خالی کھائے کو آئی ہے۔ کھاہے ڈبرا بھر کے۔'' موٹی بوا مونہہ ہی مونہہ میں بڑبڑائیں۔

''بوا ایسے مت کہیے!'' وہ جو اماں کہلاتی تھیں ان کے کان بڑے تیز تھے۔ ''بچوں کو یہی دیکھے گی ابھی تو ہم اسے کام سکھا رہے ہیں۔ رہا کھانا تو ابھی بھوکی ہے جب نیت سیر ہو جائے گی تو ہم لوگوں جیسی ہو جائے گی۔'' اس کی تربیت شروع ہو چکی تھی۔

بڑا بچہ اسکول جاتا تھا۔ (وہ خود کبھی اسکول نہیں گئی تھی۔ اس کے بعد جو بھائی تھا وہ کبھی مسجد میں مولوی صاحب کے مدرسے جا نکلتا تھا۔ یہاں پانچ برس کا بچہ اسکول جاتا ہے وہ بھی روزانہ بلاناغہ۔۔۔) یا مظہر العجائب! (مگر اسے یا مظہر العجائب کہنا نہیں آتا تھا۔) اس کو اسکول کے لئے تیار کرنا، بیگ میں ٹفن کا ڈبہ اور پانی کی بوتل ڈالنا، جوتے پالش کرنا اور اس کے جانے کے بعد چھوٹے کا خیال رکھنا اس کے ابتدائی سبق تھے۔ چھوٹے کو بوتل میں دودھ بھر کر دینا تھا جو وہ دن میں تین چار مرتبہ پیتا تھا۔ جتنی مرتبہ وہ بوتل میں دودھ ڈالتی اتنی مرتبہ صابن سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ گھر پر تو وہ اپلے پاتھ کر بھی صابن سے ہاتھ نہیں دھوتی تھی۔

ان بچوں کے پاس ایک بڑی ٹوکری بھر کر کھلونے تھے۔ ان کے باوجود ہفتے میں ایک آدھ نیا کھلونا آ ہی جاتا۔ کبھی ماں باپ میں سے کوئی لے آتا، کبھی وہ ساتھ گھومنے نکلتے تو بچے خود فرمائش کر کے لے لیتے۔ وہ زیادہ تر گاڑیاں لے کر آتے۔ کار، ٹرک، بس، پولس کا بائیک، پھر بندوقیں، ریوالور، ان کی نقلی گولیاں، پٹری پر گول گول گھومتی ٹرین، بال گیندیں لڑکے تھے نا اس لیے ان کے کھلونوں میں کوئی گڑیا نہیں تھی۔ ایک بار اس نے میلے میں پلاسٹک کی ایک گڑیا خریدنے کی ضد کی تھی۔ ابا نے اسے بھدی سی مٹی کی گڑیا لے دی۔ پلاسٹک کی گڑیا بہت مہنگی تھی۔ مٹی کی گڑیا سے کھیلنے میں اتنا مزہ نہیں آیا اور بھیا سے لڑائی ہوئی تو تیسرے دن اس نے گڑیا توڑ بھی دی۔

لیکن ایک دن لڑکوں کے اس گھر میں بھی اس کی حیران آنکھوں نے گڑیا ڈھونڈ نکالی۔ بہت بڑی تقریباً نوزائیدہ انسانی بچے کے سائز کی، موٹی، گدبدی، نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی اس نے سچ مچ کی فراک پہن رکھی تھی اور اس کے جوتے بھی بالکل اصلی تھے، بالوں میں سرخ رنگ کا ربن بندھا ہوا تھا۔ ابھی اس گھر میں اور کیا کیا

دیکھنا باقی ہے۔ ایسی بھی گڑیاں ہوتی ہیں؟ اتنی حسین، ایسی کہ معلوم ہو زندہ ہیں، بس ابھی بول اٹھیں گی۔ اس کا دل اسے گود میں اٹھانے کو مچل گیا۔

اب اسے بھابھی نے اپنے کمرے میں جھاڑ پونچھ کا کام بھی سونپ دیا تھا۔ کچھ دن سے موٹی ملازمہ کام بڑھ جانے کی شکایت کر رہی تھی۔ وہ پہلے دن کمرے میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے نظر گڑیا پر ہی، پڑی شیشے کی الماری میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ دیر تک اسے تکتی رہی تو بھابھی نے بتایا کہ یہ ان کی گڑیا تھی۔ شادی کے کچھ دن بعد وہ اسے اپنے گھر سے لے آئی تھیں۔ حیرت سے عموماً اس کی زبان گنگ رہتی تھی اور ویسے بھی وہ ایک خاموش طبیعت لڑکی تھی۔ حالانکہ بھابھی ابھی نوجوان تھیں۔ بالکل لڑکی جیسی لگتی تھیں لیکن شادی شدہ تھیں۔ ان کے دو بچے تھے۔ کیا ان کی عمر کی عورتیں گڑیا کھیلتی ہیں جو وہ اپنی گڑیا اٹھالائی تھیں؟ ایسی گڑیا ملتی کہاں ہے اور کتنے پیسوں میں ملتی ہے؟ یہ سارے سوال اس کے ذہن کی تہوں سے اٹھ اٹھ کر واپس انہیں میں دفن ہوتے رہے۔ ہاں اس گڑیا کو چھونے، اس سے کھیلنے کی خواہش جنون کی حد تک سر پر سوار ہونے لگی۔

انہیں دنوں ایک دوپہر میں اماں حسب معمول اپنے کمرے میں لیٹنے جاچکی تھیں۔ بھیابھابھی اپنے اپنے دفتر میں تھے اور وہ دونوں بچوں کو لے ان کے کمرے میں انہیں سلانے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ دونوں میں سے کوئی سونے پر آمادہ نہیں تھا۔

"اے، ہمارے ساتھ کھیلونا۔"

"بابو گڑیا کھیلیں گے؟"

"ہم لڑکی نہیں ہیں۔ گڑیا سے تو لڑکیاں کھیلتی ہیں۔ چور سپاہی کھیلتے ہیں۔"

"ہمارے ساتھ کھیلئے نا۔ ہم تو لڑکی ہیں۔ لائیں؟" اسے بھابھی کے کمرے میں داخلہ مل چکا تھا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رکھا ہوا اخروٹ کی لکڑی کا سبک اسٹول کھسکایا اور اس پر چڑھ کر گڑیا اتار لی۔ گود میں لیا تو محسوس ہوا جیسے جنم جنم کی پیاس مٹ گئی ہو۔ اس نے اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی۔ ربن کھول کر پھر سے باندھا، فراک دوبارہ پہنائی۔ لڑکے نے کبھی گڑیا نہیں کھیلی تھی لیکن ابھی اسے بھی بڑا مزہ آیا۔ چھوٹا لڑکا اپنے لکڑی کے گھوڑے پر بیٹھا جھول رہا تھا۔ بڑے نے گڑیا اسے دی۔

"لو اسے اپنے گھوڑے پر بیٹھالو۔ سیر کرا کے لے آتے ہیں۔" تینوں کھلکھلا کر ہنسے۔ یہاں آنے کے بعد پہلی مرتبہ وہ اس طرح دل کی گہرائیوں سے کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ ایسی ہنسی تو اس کے اپنے گھر میں بھی شاید ہی گونجتی ہو۔

"اب رکھ دو۔ بڑے نے کہا۔ ممی دیکھیں گی تو ڈانٹیں گی۔"

لیکن اس دن اس کی زندگی میں ایک نیا ورق کھلا تھا۔ گڑیا اکثر دوپہر میں خاموشی سے اتر کر نیچے آجاتی اور تینوں مل کر گڑیا سے کھیلتے۔ اس نے اسے دونوں بچوں کی چھوٹی بہن بنادیا تھا۔ چھوٹے کے نہ سہی لیکن بڑے بچے کے ذہن میں بہن کا تصور تھا۔ گڑیا موٹر میں سوار ہوتی۔ گھوڑے پر ساتھ بیٹھ کر گھومنے نکلتی۔ ایک دن اس کی فراک اور ربن دھو کر سکھائے گئے۔ ادھر لڑکی کو بچوں کے کپڑوں پر استری کرنا سکھایا گیا تھا۔ اس نے استری لگائی اور دونوں چیزیں پریس کیں۔ انہیں نئے سرے سے پہنایا گیا۔ ربن کو دوسرے انداز میں باندھا گیا اور پھر واپس رکھنے سے پہلے، پہلے جیسا کر دیا گیا۔ یہ گڑیا ہم اپنی بہن کو دکھاتے۔ وہ بھی اس سے کھیلتی۔ میری بیچاری ننھی بہن۔ آٹھ سال کی ہو گئی

اسے کوئی گڑیا نہیں ملی۔ اسے دیکھے گی تو وہ کیسی خوش ہو گی، اس نے سوچا۔ اب اس کی آنکھوں کی حیرانی کم ہونے لگی تھی لیکن دل میں خواہشات کا طوفان اٹھنے لگا تھا۔ آج ان لوگوں نے اسکول اسکول کھیلا تھا۔ یہ آئیڈیا بڑے لڑکے کا تھا۔ وہ ٹیچر بنا۔ لڑکی اور گڑیا اسٹوڈنٹ۔ تھوڑی دیر کو چھوٹا لڑکا بھی اپنا ہیلی کاپٹر اڑانا بھول کر 'کلاس' میں آ بیٹھا تھا۔ ان لڑکوں کے پاس سچ مچ کا بورڈ تھا۔ کافی بڑا۔ لیکن وہ سیاہ نہیں بلکہ سفید رنگ کا تھا۔ اس پر لکھنے کا خاص قلم تھا جو خوب موٹے حروف لکھتا۔ جب چاہو صاف کر دو اور دوسرا کچھ لکھ لو یا تصویر بنالو۔ لڑکے کے پاس رنگین تصویروں والی بہت ہی خوبصورت کتابیں تھیں۔ اب تو ایک چمکیلی سی تصویروں والی کتاب چھوٹے بچے کے لئے بھی آ گئی تھی۔ وہ اب ساڑھے تین سال کا ہو رہا تھا۔ اور اسے اسکول میں ڈالنے کی بات ہو رہی تھی۔ وہ کتاب بڑی لبھاؤنی تھی۔ اس کا بھائی مدرسے میں جو کتاب پڑھتا تھا وہ تو شکل سے ہی ایسی لگتی تھی کہ پڑھنے سے انسان بھاگے۔ بس کالے کالے حروف، ملگجا کاغذ۔ ہاتھ لگاؤ تو پھٹے۔ بابو جس کتاب سے ٹیچر بن کر اے بی سی ڈی پڑھا رہے تھے وہ اگر بھیا کو ملتی تو پڑھنے سے نہ بھاگتا۔

یہاں اماں نے اس کے لئے یسرنا القرآن منگا دیا تھا۔ شام کو تھوڑی دیر بٹھا کر پڑھاتی تھیں۔ اس کا جی چاہتا ان تصویروں والی کتابوں سے بھی پڑھے اس لیے بابو نے جو اسکول والا کھیل شروع کیا تو اسے بہت ہی اچھا لگا۔

''کہتے ہیں اچھا نوکر بھی قسمت سے ملتا ہے۔'' ایک دن اماں کے پاس سے وہ پڑھ کر ہی تو وہ کسی سے کہہ رہی تھیں۔ شاید کوئی ملنے والی آ نکلی تھیں۔ ''یہ لڑکی بس اللہ کی بھیجی آ گئی۔ دونوں بچوں کو سنبھال لیتی ہے۔ بڑا آرام ہو گیا ہے۔ اصل گھر میں سب سے بڑی تھی۔ کوئی نو، دس برس کی۔ اس کے بعد ان کی اماں کے چار چنے گی پوٹے۔ انہیں یہی سنبھالتی تھی۔ بس یہاں کے طور طریقے سیکھنے تھے۔ ہے ذہین۔ جلدی سیکھ لے۔''

اب کیا نوکروں کو بھی نظر لگتی ہے۔ لے بھلا ہو۔ کل ہی تو اماں نے یہ بات کہی تھی یا شاید پرسوں اور آج صبح وہ گھر سے غائب پائی گئی۔

لوگ ایسے پریشان ہوئے کہ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پرائی لڑکی۔ اور آج کل جو حال ہے نہ پانچ برس کی محفوظ نہ پچاس کی۔ گھر میں ہڑ کمپ مچ گیا۔

''اجی، لڑکی سے پہلے سامان تو دیکھئے۔ ہم پہلے ہی نہ کہتے تھے۔ بیل جیسے دیدوں سے ہر چیز تاکے تھی۔ رات دلہن شادی سے آ کر زیور اتار کر باہر ہی رکھن ہیں۔'' موٹی ملازمہ نے کہا۔ کوئی لگا رہا ہو گا ساتھ۔۔۔ بھابھی نے جلدی سے سنگار میز کی دراز کھولی۔ وہ جب جھمکے اتار رہی تھیں تو وہ پاس کھڑی ٹکر ٹکر مونہہ دیکھ رہی تھی۔

جھمکے وہیں تھے۔ سونے کی چوڑیاں بھی۔

''دلہن تم نے پرسوں بینک سے پیسہ نکالا تھا۔ لاپرواہ ہو۔ کہاں رکھا تھا؟'' اماں بھی بول پڑیں۔

بھابھی نے جلدی سے بیگ ٹٹولا۔ پانچ پانچ سو کے نوٹوں کی گڈیاں۔ روپے گنے۔ پورے تھے۔ اسے کپڑے رکھنے کے لیے جو اٹیچی دی گئی تھی وہ وہیں تھی۔ اس میں کپڑے بھی تھے۔ تب؟

''تب کون چیز؟ کسی کے ساتھ نکل گئی ہے۔'' ملازمہ نے کہا۔

''اے ہے بوا! خدا سے ڈرو۔ دس ایک سال کی بچی۔'' اماں نے کہا۔

''اجی آج کل ٹی وی دیکھ دیکھ کے دس برس میں پوری عورت ہو جاں ہیں'' بوا نے جواب دیا۔

میاں بیوی دونوں نے چھٹی لی۔ پولیس میں رپورٹ کریں تو چائلڈ لیبر والے پکڑیں گے۔ خیر اس کی نوبت آئی تو کہہ دیا جائے گا کہ غریب رشتہ دار ہے۔ماں باپ نے یہاں پڑھانے کے لئے بھیجا ہے۔ مصیبت کر دی لڑکی نے۔اماں بہت لاڈ کرتی تھیں۔سب سے زیادہ آرام انہیں کو تھا۔ڈرتی تھیں اگر دل نہ لگا یا نا آسودہ رہی تو چل دے گی۔اب بھگتیں بلکہ سب کو بھگتوائیں۔گاڑی لے کر نکلے۔کیا پتہ ٹرین یا بس سے کہیں نکل گئی وہ تو کیا حشر ہو گا۔گھر پہنچ گئی تو خیر ،نہ پہنچی تو اس کے ماں باپ کو کیا منہ دکھائیں گے۔غریب بے چارے۔بھروسے پر لڑکی سونپی تھی۔ چلتے وقت رخصت کرنے کو کھڑی ماں نے میلے کچیلے آنچل سے نہ جانے کن خاموش آنسوؤں کو پونچھا تھا۔

سارے دن کی تگ ودو کے بعد اسٹیشن پر بیٹھی ملی۔ چھوٹی چھوٹی حرماں آنکھوں کی حیرانی بکھیرتی، آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ کر یہ سمجھنے کی کوشش کرتی کہ کون سی گاڑی اس کے گاؤں جائے گی۔ ہونٹوں پر پڑ آیاں بندھی ہوئی تھیں۔ گالوں پر آنسو خشک ہو چکے تھے۔ بغل میں گڑیا دبی ہوئی تھی اور اے بی سی ڈی والی پرائمری۔

نجمہ ثاقب

میا

جندر و اور ملکا دونوں ایک پیٹ کے جنے تھے۔ بچپن میں وہ میا کے ساتھ ایک ہی کھاٹ پہ سویا کرتے۔ ایک داہنی جانب اور دوسرا میا کی باہنی جانب کو لہے کو آڑا کیے گھٹنے پیٹ میں گھسائے پڑا رہتا۔ میا ندی پہ پانی بھرنے جاتی تو دونوں ننگے پاؤں لمبے لمبے کرتوں میں الجھاتے اس کے پیچھے دوڑتے۔ گھاٹ پہ شکستہ تختوں والی ایک کشتی کئی مہینوں سے آنکڑے سے بندھی کھڑی تھی۔ جب ہوا اس کے ٹوٹے کناروں پہ جھولتی تو وہ اس کے لمس سے ہلکورے لینے لگتی۔ جندر و ملکا کے ساتھ کشتی میں اتر جاتا۔ اور دونوں اس کے فرش پہ گرے پڑے سنگریزے اٹھا اٹھا کر شفاف پانی سے جھانکتی ندی کی دلدلی سطح پر پھینکتے رہتے۔ جتنی دیر میں میا سر پر اوپر، نیچے مٹکیوں کی مچان سی بناتی۔ وہ ندی کے فرش پہ سنگریزوں کی ڈھیری سی لگا دیتے اور کشتی غریب کی جیب کی طرح یکدم خالی ہو جاتی۔ مگر پتہ نہیں کیسے اگلے روز تک اس کا تختہ پھر سنگریزوں سے اٹا پڑا ہوتا۔

میا کے گھر میں کالے چکتوں والی ایک گائے تھی۔ جو دن میں دو مرتبہ کھیر سے زیادہ گاڑھا اور کھمبیوں سے زیادہ سفید دودھ دیتی تھی۔ شام پڑنے پہ جب سورج پہاڑ کی اوٹ میں اتر کر آسمان کے کناروں پہ دھڑا دھڑ لالے کے پھول مارتا۔ میا تانبے کا ڈول لے کر گائے کے نیچے بیٹھ جاتی۔ جندر و اور ملکا کھیل کھلاڑہ چھوڑ، دوڑے دوڑے آتے اور ایک ایک تھن کے نیچے اکڑوں بیٹھ کر منہ کھول لیتے۔ میا گائے کا تھن ہتھیلی کی ٹکلی پہ اٹھاتی اور انگلیوں کے دباؤ سے شیر گرم کی دھاریں ان کے مونہوں میں گراتی جاتی۔ دونوں گیلا حلق لیے باہر گلی میں دوڑ جاتے۔

گلی کے کونے میں خیرو کوچوان کا گھر تھا۔ جب شام ڈھل جاتی اور روشنی اندھیرے سے پوری طرح گتھم گتھا ہو جاتی تو وہ اپنے تانگے سمیت نکڑ سے نمودار ہوتا۔ جندر و اور ملکا دونوں دروازے پہ کھڑے اس کی راہ تکتے تھے۔ جونہی ٹخ ٹخ بجتا تانگہ ان کے قریب آتا۔ خیرو چابک سے لکڑی کے پہیوں کو کھٹکھٹاتا۔ دونوں اچک کر تانگے پہ سوار ہو جاتے۔ جندر و میانی پہ بیٹھ جاتا۔ ملکا پچھلی جانب پلاسٹک منڈھی سیٹ پہ پھسلنے لگتا۔ دونوں کی کخ کخ کی آوازوں میں گھوڑا رہوار چلتا خیرو کے احاطے میں داخل ہوتا۔ خیرو کندھے کی چادر جھاڑ کر پچھواڑے میں اپنے کچے کوٹھے کی جانب نکل جاتا۔ جہاں اس کی بیوی پروین گرم گرم پھلکے چولہے سے اتارتی اور مسور کی دال کو سفید زیرے کا شوں شوں کر تا بھگار دیتی۔

خیرو دال میں لتھڑے لجلجے لقمے منہ میں دھرتا جاتا اور پروین سے باتیں کرتا جاتا۔

”کھاٹ کو دھوپ دلوادی؟“

”ہاں سب کھٹمل، کیڑوں کا انت ہو گیا۔ آج دھوپ بڑی سرخ تھی۔“

”تم پانی بھر لو میں اتنے میں منے کو بہلاتا ہوں۔“

''پانی تو میں بھر چکی۔ لیکن آج لحاف میں روئی ڈالنے کا کام رہ گیا۔ گھوڑے کے راتب کے لیے چھٹکن بھی علیحدہ پڑی ہے۔''

''اسے چھٹکن کے کنستر ہی میں پڑا رہنے دو۔''

''لے جا کر راتب میں ملا دیتے تو اچھا تھا۔ خالی چارے سے گھوڑے کا معدہ بگڑ جائے گا۔''

''رہنے دو۔'' خیرو دونوں بازو ہوا میں اٹھا کر لمبی انگڑائی لیتا۔

''جندرو اور ملکا آکر لے جائیں گے۔'' اور گھڑی بھر بعد ہی دونوں آن دھمکتے۔ چھٹکن لے جا کر راتب میں ملاتے۔ گھوڑے کو تانگے سے کھول کر تھان پہ کھڑا کرتے۔ بوری کا منہ گولائی میں دوہرا کر کے کشتی کھرلی بناتے اور گھوڑے کے آگے راتب رکھتے۔ ملکا لپک کر کھرکھنا اٹھالاتا اور دلار سے گھوڑے کے بدن پر پھیرتا جاتا، جندرو پانی کا ڈول بھرتا اور بوری ہٹا کر گھوڑے کے آگے دھرتا۔ گھوڑے کی پیال تشکر کے احساس سے ہلنے لگتی۔ دونوں اچک اچک کر اسے ہاتھ لگاتے، اس کی نرمی کو چھو کر محسوس کرتے اور گھوڑے کے گلے لگ لگ کر اس سے اپنائیت کا اظہار کرتے۔ تاآنکہ خیرو بھرے پیٹ کے خمار میں جھومتا احاطے کے اندر آتا اور دونوں کو بہلا پھسلا کے دروازے پہ پکار لگاتی میا کے حوالے کرتا۔

میا ہر ہفتے دس دن کے بعد آم کے پیڑ تلے سوت کا تانا باندھتی تھی۔ جندرو اور ملکا گلی کے طول پر اپنے اپنے حصے کی لکڑیاں گاڑتے، میا رنگین دھاگوں کی پونیاں ہاتھ میں لیے ایک سرے سے دوسرے تک تانا بانا کرتی۔ دونوں صفا مروہ پر سعی کرتے ہوئے اس کے ساتھ دوڑتے ہوئے جاتے اور دلکی چال واپس آتے۔ میا نہ تھکتی تھی نہ رکتی تھی۔ بس چلتی ہی جاتی تھی۔ دونوں اکتا کر آم کی شاخوں سے لٹک جاتے۔ پیڑ پہ چڑھ، درختوں میں چھپ کر اک دوجے پہ کچی امبیوں کی بارش کرتے۔ پتھر مار مار کر شاخوں سے پرندے اڑاتے اور تھک کر کسی درخت کے تنے سے ٹک کر سو رہتے۔

ایک دن دونوں تاروں سے بھرے آسمان کے نیچے لیٹے باتیں کر رہے تھے۔ جندرو بولا :

''آم کے پیڑ کی ٹیشی پہ چڑھ جائیں تو آسمان کو ہاتھ لگا سکتے ہیں۔'' ملکا جندرو کی جانکاری سے دل ہی دل میں متاثر ہوا اور کہنے لگا :

''اس طرح تو تاروں کو بھی پکڑا جا سکتا ہے۔''

''ہاں ہاں ! کیوں نہیں ؟ آسمان کو چھونا یا تاروں کو پکڑ لینا ایک بات ہی تو ہے۔''

''بھایا جی !'' ملکا کچھ سوچ کر بولا۔

''یہ تارے دن میں کیوں دکھائی نہیں دیتے۔ رات کو اچانک کدھر سے آجاتے ہیں ؟''

جندرو کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر ہوا میں لاتیں چلاتے ہوئے بولا :

''تارے اپنی میا کے ساتھ رہتے ہیں۔ میا جب آتی ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ چلے آتے ہیں۔ وہ جاتی ہے تو یہ بھی ساتھ چلے جاتے ہیں۔'' اس بات پہ ملکا کی آنکھیں تجسس سے چمک اٹھیں۔

''تاروں کی میا کون بھلا ؟''

جندرو ترنت بولا :

''چندرما تاروں کی میا ہی تو ہے۔ دن کو کبھی دیکھا ہے تو نے اسے؟''

''چندرما؟'' ملکا کے سامنے فکر کے نئے در وا ہوئے۔

''تو ان کا بھاپا کون ہے بھائی جی؟''

''سورج'' جندرو منہ پکا کر کے بولا: ''ان کا بھاپا سورج ہے۔''

''تو کیا تاروں کا بھاپا ان کے ساتھ نہیں رہتا؟''

''وہ ان کے ساتھ کیوں رہنے لگ؟ ہمارے بھاپا جی کیا ہمارے ساتھ رہتے ہیں؟'' میا دونوں کے بیچ کھاٹ پہ پڑی چپکی سنتی تھی۔ بھپک کے بولی:

''تمہارے بھاپا تو گور میں پڑے سوتے ہیں۔ وہی ان کا ٹھکانہ ہے۔ تم ان کے ساتھ بھلا کیسے رہ سکتے ہو؟''

ملکا کھسک کر ماں کی پسلی میں گھس آیا اور بولا:

''کیا وہ تم سے ملنے آتے ہیں میا؟''

''ناں! میا نے برف کی سی آہ بھری۔ اب میں ہی ان سے ملنے جاؤں گی۔ جب سفید کپھن پہنوں گی اور تم مجھے مٹی میں دبا آؤ گے۔''

''نہیں میا جی!'' جندرو دوسری پسلی میں گھس آیا۔

''تم ہمیں چھوڑ کر کہیں نہ جائیو۔ ہمیں تمہارے بنا رہنے کی عادت جو نہیں ہے۔''

مگر جس طرح بچپن کی بہت سی عادتیں بڑے ہونے پر چھوٹ جاتی ہیں۔ اسی طرح جندرو اور ملکا دونوں کے ہاتھوں سے میا کا پلو بھی چھوٹ گیا۔ دونوں بیاہ کے بعد اپنی اپنی کوٹھڑی کے ہو کر رہ گئے۔ اور میا آم کے پیڑ تلے سالوں اکیلی چلتی، تانا بانا کرتی رہی۔ ملکا کی عورت آلکس کی ماری، صبح کی لگی ایک ہی کام میں شام کر دیتی۔ چار دن اس نے لگ کے ریندھا پکایا۔ مگر پانچویں دن برتن پٹخ کر کڑک مرغی کی طرح بیٹھ رہی۔

جندرو کی بیوی سے بھلا اس کی ہیکڑی کہاں برداشت ہوتی۔ وہ بھی جم کے کھڑی ہو گئی اور جندرو سے کہنے لگی:

''مجھ سے تمھارے بھائی اور ماں کے پراگ نہیں ڈالے جاتے۔ اپنا اپنا کندھا اور اپنا اپنا بھار۔ میں دوسروں کے بوجھ سے اپنے مونڈھے کیوں چھیلوں؟'' یہ کہہ کے اس نے چار ٹھیکرے اٹھائے اور اپنا چولہا چوکا گھسیٹ کر کوٹھڑی کے اندر کر لیا۔ یوں دونوں بھائی اپنا اپنا پکانے اور اپنا اپنا کھانے لگے۔

میا آم کے پیڑ تلے کھاٹ پہ برتن دھرے بیٹھی رہتی۔ دن چڑھتا تو جندرو کی بیوی برتن میں روٹی، سالن یا اچار کی ڈلیا ڈال جاتی۔ رات ہوتی تو ملکا کی عورت جو ساگ بھات میسر آتا، سامنے لار کھتی۔ میا نہ بولتی نہ شکوہ کرتی بس اللہ غنی کرتی، گائے کی سیوا میں لگی رہتی۔ چارا لاتی، کاٹ کر اس میں بھوسہ ملاتی۔ صبح شام دودھ نکال کر پاؤ بھر اپنی لٹیا ڈال کر باقی دونوں بھائیوں میں برابر تقسیم کرتی۔ ندی پہ جا کے اپنے گندے سندے کپڑے دھوتی اور آم تلے کھاٹ پہ بیٹھی دل ہی دل میں رب کا شکر ادا کرتی کہ بیٹوں نے صحن میں ہی سہی، گھر میں جگہ تو دی ہے۔ اگر ان کی گھر والیاں اسے نکال باہر کرتیں تو اس عمر میں کیسے ذلت کی کالک سے اپنا چہرہ پوتتی؟

ایک روز پچھم کی طرف سے تیز ہوا کا طوفان اٹھا۔ ہوا کی رتھ پہ سوار ہو کر کالے بادلوں کی فوجیں اتریں۔ جھکڑ چلے، بگولے ناچے، سیاہ ناگن جیسی ایک بدریا، عین پیڑ کے اوپر آ کر برسی۔ اس زور کا مینہ پڑا کہ پیڑ کا پتا پتا ٹپ ٹپانے

لگا۔ بڑھیا گیلم گیلی کھاٹ پہ سکڑی سمٹی بیٹھی رہی۔ اس نے گھٹنوں کو جوڑ کر بازؤں سے باندھا اور انہیں اپنا کھچڑی بالوں والا سر اوڑھا دیا۔ زبان لپیٹ کر سردی سے بجتے خالی مسوڑھوں کے اندر رکھی اور کھن کھن کرتی بارش کی آواز سننے لگی۔

جندرو پیشاب کرنے کوٹھڑی سے نکلا تو میا سرکتے سرکتے کھاٹ کے پائے پہ آ بیٹھی تھی۔

''اے میا! سردی سے مرے گی کیا؟ چل اٹھ میں تیری کھاٹ چھپریا میں ڈال دوں۔''

''میں نے چھپریا میں گائے باندھ ڈالی ہے۔ باہر نکالی تو بھیگ جائے گی۔'' میا جھرجھرائی۔

''نہ گائے بھیگے گی نہ تو۔ گائے کے ساتھ تیری کھاٹ بھی دھرتا ہوں۔ گائے بھی وہیں رہے گی اور تیری جگہ بھی بن جائے گی۔ دیکھ تو میں کیسا جگاڑ لگاتا ہوں۔'' پھر جندرو نے کھاٹ چھپریا میں رکھی اور گائے کی رسی کھاٹ کے پائے سے کس کر باندھ، اسے کھاٹ کے برابر میں کھڑا کر دیا۔ گائے اور میا دونوں گوڑھی سہیلیوں کی طرح اک دوجے کے پہلو میں راز و نیاز کرنے بیٹھ گئیں۔ البتہ اس گھسم گھسیڑ میں جندرو پورے بدن سے بھیگ گیا۔ رات بھر میا اس کی فکر میں گھلا کی۔ صبح ہونے تک تاپ نے ایسا پنڈا پکڑا کہ وہ بھانبڑ کی طرح جلنے لگا۔ باہر ابھی تک ٹپ ٹپ مینہ پڑ رہا تھا اور شائیں شائیں کرتی ہوا اتنی منہ زور تھی کہ لگتا تھا ابھی چھپریا کی چھت پھونس سمیت اڑا کر لے جائے گی۔ ادھر گائے کے لبالب تھن پھٹے پڑتے تھے۔ دودھ تھا کہ ٹپک پڑنے پہ تیار تھا۔ میا اٹھنے کے قابل ہوتی تو اب تک اسے دھو کر فارغ کر چکی ہوتی مگر اس وقت اسے اپنا بھی ہوش نہ تھا نہ اٹھتی تھی نہ بولتی تھی۔ نہ گائے کی جانب تکتی ہی تھی۔ گائے بے تاب ہو کر کھاٹ کے گرد گھومنے لگی۔

جب خوب اچھی طرح دن چڑھ آیا اور مینہ کا زور قدرے کم ہوا تو ملکا کو چائے کی طلب نے ستایا۔ اس کی عورت گڑوی اٹھائے چھپریا میں آئی تو تاپ میا کے دماغ کو چڑھ چکا تھا اور وہ واہی تباہی ہذیان بکے جاتی تھی۔ اس نے آواز دے کر ملکا کو بلایا۔ ملکا نے جندرو اور جندرو نے اپنی بیوی کو آواز لگائی۔ آناً فاناً چاروں اکھٹے ہو گئے اور کھاٹ کا ایک ایک پایہ پکڑ لیا۔

جندرو کی بیوی بنفشے کا کاڑھا بنا لائی۔ ملکا کی عورت تیل میں بادام جلا کر کنپٹیوں پہ مالش کرنے لگی۔ ملکا کپڑے کا گولا سا بنا کر پاؤں جھسنے لگا۔ جندرو نے میا کی دونوں ٹانگیں اپنے ہاتھوں میں لیں اور دبا دبا ان کی بھاپ نکالنے لگا۔ سب میا کی سیوا میں لگ گئے۔ پھر بعد حکیم جی نے آ کر دوائیوں کی پڑیاں باندھیں اور کہنے لگے :

''بوڑھی ہڈیوں میں بدلتے موسموں کو سہنے کی طاقت کہاں؟ ماں کو چھپر تلے سے اٹھاؤ اور کوٹھڑی کے اندر ڈالو۔'' حکیم جی کی بات سن کر دونوں بیٹے اک دوجے کا منہ تکنے لگے۔

جندرو بولا: ''میری کوٹھڑی برسات کے دنوں میں چھلنی بنی رہتی ہے۔ چارپائی برابر جگہ ہمارے لیے بچتی ہے۔ میں میا کو لے جا کر کہاں رکھوں گا۔''

ملکا نے کہا: ''میری تو کوٹھڑی ہی چارپائی برابر ہے۔ اب کیا میا کی کھاٹ اپنی کھاٹ کے اوپر دھر لوں؟'' اس بابت دونوں بھائیوں میں بڑی تو تو میں میں ہوئی۔ بالآخر دونوں نے دھوتیاں اڑسیں۔ لانگڑ کسے۔ بیویوں نے اوڑھنیاں کانوں کے پیچھے لے جا کر کمر پہ پھینکیں اور چاروں جت گئے۔ دونوں کوٹھڑیوں کے درمیان صحن کو قطع کرتی ہوئی حد بندی کی لکیر کھینچی اور رات تک گیلی مٹی کی مینڈھ سی بنا کر دیوار کی عارضی نشانی کھڑی کر دی مگر چھپریا تک

پہنچنے کے سے پہلے ہی دیوار رک گئی۔ کیونکہ آم کا پیڑ اس خط کے عین وسط میں آ جاتا تھا جو دیوار کو سیدھے رخ پہ چھپریا تک لے جاتا تھا۔

آم کا یہ پیڑ میا کے بیاہ سے پہلے کا تھا۔ سو سب دیکھتا اور سنتا تھا۔ اس کو کاٹنے کا مطلب خود کو پرکھوں سے جا کے ملتے شجرے کھتونیوں سے کاٹ دینا تھا۔ سو دیوار کا کام یہاں پہنچ کر تمام ہو گیا۔ ان دنوں ندی چڑھ چڑھ کے آئی اور برساتی نالے فر فر بہے۔ گھسیارے گھاس کے گٹھے بنا بنا کر بھوروں میں ڈالنے لگے۔ کسان لوگ رات رات بھر جاگ کر کھیتوں کی مینڈھیں ٹھیک کرتے رہے اور خیرو تانگہ جتا چھوڑ کر دوڑا دوڑا میا کی خبر لینے چلا آیا۔

بڑھیا اور گائے پہلو بہ پہلو چھپریا تلے پڑی ہوئی تھیں۔ میا کے سینے میں پن چکی کا دخانی انجن چل رہا تھا اور وہ کھوں کھوں کرتی گوبر پر برابر تھوک کے پٹاخے پھوڑ رہی تھی۔ یہ سب دیکھ کر خیرو کے دل کو دھکا سا لگا۔ اس نے آواز دے کر دونوں بیٹوں کو بلوایا۔ پھر نہ انہیں ڈانٹا نہ ہی کوئی ملامت کی۔ کہا تو صرف اتنا کہ :

''تم نے گھر کا بٹوارہ تو کر لیا اب گائے کا بٹوارہ کب کرو گے ؟'' ملکا اور جندرو اک دوجے کو دیکھتے ہوئے خیرو کا منہ تکنے لگے۔

خیرو بولا: ''گائے تیری ہے نہ میری، یہ صرف اور صرف میا کی ہے اور اس کے بعد اسے ملے گی جو آخری دنوں میں اسے ساتھ رکھے گا۔ اس کی سیوا کرے گا اور اس کا گو موت اٹھائے گا۔ یہی میا کی مرضی بھی ہے۔

ملکا جھٹ بولا : ''میں تو پہلی بارش سے میا کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ مگر یہ مانے تو۔۔۔''

جندرو بھائی کے سفید جھوٹ پہ بھچک ہی تو گیا مگر بولا کچھ نہیں اور خیرو کے جاتے ہی ماں کی کھاٹ پکڑ کے کھڑا ہو گیا۔

اب جندرو ماں کے سرہانے تھا اور ملکا پائنتی پہ۔ دونوں کی بیویاں دائیں، بائیں مستعد کھڑی اپنے اپنے شوہر کے ایک اشارے کی منتظر تھیں۔

ملکا نے کھاٹ اپنی جانب کھینچی اور جندرو نے اپنی جانب، میا کے بدن کو جھٹکا لگا تو وہ کھاٹ کے دونوں بازوؤں پہ زور ڈال کر اٹھ بیٹھی اور انہیں اشارے سے روک کر بولی:

''میرے بچو! آج کی رات مجھے یہیں پڑا رہنے دو اور اپنے اس جھگڑے کو صبح تک اٹھا رکھو۔ صبح میں دیکھوں گی کہ مجھے تم دونوں میں سے کس کے ساتھ رہنا ہے۔'' دونوں ان مانے دل سے وقتی طور پر ٹل گئے۔

رات بھر اپنی اپنی کوٹھڑی میں لیٹے دونوں بھائی کروٹیں بدلتے اور دوسرے فریق کے طمع پہ منہ بھر بھر کر نفرین بھیجتے رہے۔

ملکا نے اپنی بیوی کو بتایا کہ بچپن میں کس طرح جندرو اس کے حصے کی چیزوں پہ قابض ہو جاتا اور وہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے اسے اپنا حصہ بخوشی دان دیتا مگر اب نہیں! ہر گز نہیں۔

جندرو نے اپنی بیوی کو ان ساری زیادتیوں کی تفصیل بتائی تو ملکا بڑے ہونے کے ناطے اس کی خاطر روا سمجھتا تھا اور جن کی بابت اس نے آج تک کسی سے بات بھی نہ کی تھی۔ مگر میا کوئی چیز تو نہیں، جیتی جاگتی انسان ہے۔ چھوٹا بیٹا ہونے کے ناطے اس پہ میرا حق فائق ہے۔ اب میں کوئی اور زیادتی نہ ہونے دوں گا۔

مرغ کی پہلی بانگ ہوتے ہی دونوں کوٹھڑیوں سے باہر نکل آئے۔ بوندا باندی جاری تھی اور آوارہ ہوائیں آم

کی شاخوں میں سیٹیاں بجاتی تھیں۔ دونوں سیدھے چھپریا میں جا گھسے مگر یہ کیا؟ گائے چھپریا کے کونے میں کھڑی دیکھتی تھی اور میا کی کھاٹ خالی ڈھنڈار تھی۔

دونوں بدحواس ہو کر صحن میں نکلے اور کیچڑ میں پھسلتے پھسلتے بچے۔ میا آم کے پیڑ تلے آڑی ترچھی ہوئی پڑی تھی۔ اس کا دھڑ حد بندی کی لکیر کو دونوں جانب سے برابر کاٹتا عین درمیان میں زمین بوس تھا۔ دونوں آنکھیں کھلی تھی اور سانس کبھی کی ہوا ہو چکی تھی۔

کرن نعمان

گیلی مٹی کا بت

آسمانِ پر نور کے ہالے میں لپٹا سینکڑوں ستاروں کے جھرمٹ میں جگمگاتا چودھویں کا چاند اور زمین پر دوستارہ آنکھیں، لبوں پر شوخ مسکراہٹ لیے محبت کے احساس سے بھرپور سکھاں کا چاند آہستہ آہستہ دم بہ دم اس کی طرف قدم بڑھاتا اسے چھو لینے کو بے قرار تھا۔ چاندنی میں نہائی ان ساعتوں میں وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے چھو لے، امر کر دے، اس کے مٹی سے بنے وجود کو سونا کر دے۔ اس کی قربت کے بڑھتے احساس کے ساتھ اس کی سانسیں جامد ہوئی جاتی تھیں۔ جذبات کے دہکتے الاؤ کی لالی سکھاں کے چہرے پر سمٹ آئی تھی۔ حیا سے اس کی پلکیں جھکی جا رہی تھیں۔ اس کی خوشبودار قربت کا احساس اس کے حواس پر چھاتا چلا جا رہا تھا۔ ایک لمحے کی دوری پر تھا اس کا ہاتھ، تب ہی، بس اس پل ایک چنگھاڑ نما چیختی آواز نے اس کے کانچ جیسے خواب کو چکنا چور کر دیا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے کوئی نادیدہ ہاتھ اسے جنت کے دروازے سے کھینچ کر جہنم کے دہانے پر لے آیا ہو۔

دھونکنی کی طرح چلتی سانسوں کو سینے پر ہاتھ رکھ کر تھامنے کی کوشش کرتی وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیا اماں! تو بھی نا! کتنا پیارا خواب دیکھ رہی تھی۔ پر تیری ریل کی سیٹی جیسی آواز نے سب برباد کر دیا۔ کبھی پیار سے بھی آواز دے لیا کر۔''

''دو گھنٹے پہلے پیار سے ہی اٹھایا تھا اپنی دِھی رانی کو، پر یہ پیار کی زبان تجھے راس آئے تبھی تو نا۔ سورج متھے پر آگیا پر میری دِھی خوابوں کی دنیا سے باہر ہی نہیں آتی۔''

اماں نے میلا کچیلا لحاف زور زور سے جھٹک کر تہہ لگا کر ٹرنک کے اوپر رکھے دوسرے لحافوں پر رکھ دیا۔ سکھاں بستر سے نکل کر مٹی کے چولھے کے پاس آ بیٹھی تھی۔

''ہائے اماں! تجھے کیا پتا یہ خوابوں کی دنیا اور اس میں بسنے والے لوگ کتنے پیارے ہوتے ہیں۔'' اس نے انگڑائی لے کر قریب پڑا تنکا اٹھایا اور چولہے میں پڑے ادھ جلے کوئلوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔

''ہوش کر سکھاں! اب تو بچی نہیں رہی۔ بیاہنے کی عمر ہو گئی ہے تیری۔ تیرا ابا گیا ہے آج بھائی کمالے کی طرف۔'' اماں کی بات پر سکھاں کا ماتھا ٹھنکا۔

''کیوں اماں! کیوں گیا ہے ابا وہاں۔'' اس نے سلور کے چھوٹے سے مگے میں پانی لے کر منہ میں بھر لیا اور دروازے کی طرف آگئی۔

''تیرے بیاہ کی بات کرنے گیا ہے۔ دو ہفتے پہلے بھائی کمالے نے اپنے قادر کے لیے تیرا ہاتھ مانگا تھا۔''

چارپائی پر بیٹھی اماں نے مٹر چھیلتے ہوئے اسے بتایا اسی لمحے پردہ اٹھا کر کلی کرتی سکھاں کی نظر سامنے کھڑی ٹرین پر گئی۔ اماں کیا بول رہی تھی اب اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ کھڑکیوں سے جھانکتے دروازوں میں لٹکتے لوگوں میں وہ نہ جانے کس کا چہرہ ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے انجن نے زوردار سیٹی بجائی۔ رینگتے ہوئے پہیوں نے آہستہ آہستہ

رفتار پکڑنا شروع کی اور پھر ہوا سے باتیں کرتے ہوئے ٹرین کو بھگا لے گئے۔ وہ ٹاٹ کا پردہ چھوڑ کر اندر اماں کے پاس آ بیٹھی اور کوئلوں پر گرم کی ہوئی چائے کے ساتھ ٹھنڈا پراٹھا کھانے لگی۔

☆☆☆☆

لانڈھی اسٹیشن سے کچھ آگے ریل کی پٹریوں کے قریب بیس پچیس گھروں کی اس آبادی میں ایک چھوٹا سا دو چھوٹے کمروں کا یہ گھر بشارت سائیں کی کل کائنات تھا جس میں وہ اپنی گھر والی، بیٹی سکھاں اور دو چھوٹے بیٹوں کے ساتھ رہتا تھا وہ خود ایک فیکٹری میں مزدور تھا۔ سکھاں کو اس نے پانچویں تک پڑھایا تھا اور آگے بھی پڑھانا چاہتا تھا۔ گورنمنٹ اسکول کی فیس تو کم تھی لیکن کاپیوں کتابوں کا خرچہ بہت تھا۔

سکھاں سانولے رنگ کی مگر بے حد پر کشش نقوش والی انیس سالہ سادہ سی لڑکی تھی۔ سکول چھوڑنے کے بعد گھر کے کاموں میں اماں کا ہاتھ بٹانا اور چھوٹے بھائیوں کو سنبھالنا پڑھانا ہی اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ آتی جاتی ٹرینوں کو دیکھنا اس کا من پسند مشغلہ تھا اور اب تو یہ ٹرینیں جیسے اس کی جان کا روگ ہی بن گئی تھیں۔

تین سال پہلے تک سب کچھ اپنی ڈگر پر تھا۔ اس کی آنکھیں خوابوں کی عادی نہ تھیں پر شدید گرمیوں کی ایک رات میں بھینی بھینی خوشبو میں بسا ایک حسین نوجوان اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سپنوں کی وادی میں لے آیا تھا جہاں نہ کوئی غم تھا، نہ کوئی پریشانی اور نہ ہی غربت تھی۔ ہر طرف چاہت کے پھول کھلے تھے اور مدہوش کر دینے والی ہوائیں تھیں۔ یوں تو وہاں کوئی گاڑی رکتی نہ تھی، سیدھی لانڈھی کے اسٹیشن کی طرف بڑھ جاتیں، پر کبھی کبھی کسی خرابی کی وجہ سے کوئی گاڑی رک بھی جاتی تھی۔ اس رات بھی انجن فیل ہو جانے کی وجہ سے بستی کے سامنے گاڑی کھڑی ہو گئی تھی۔ اماں ابا رشید چاچا کی طرف کورنگی گئے ہوئے تھے۔ دونوں چھوٹے بھائی سو گئے تو وہ ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر ڈیوڑھی میں ہی بیٹھ گئی۔ کراچی کا خاصا یہ ہے کہ کتنی ہی گرمی کیوں نہ ہو، ہوا چلتی رہتی ہے۔ گھر کے سامنے ایک چھوٹا میدان تھا، اس سے آگے پٹریاں جن پر کافی دیر سے ایک ٹرین کھڑی ہوئی تھی۔ گرمی سے بے حال مرد اور کچھ بچے نیچے اتر آئے تھے اور زور زور سے ریلوے کے پورے نظام کو بے ہودہ گالیوں سے نواز رہے تھے۔ عورتیں پنکھے جُھل رہی تھی۔ جن کے پاس پنکھے نہیں تھے وہ کسی گتے سے یا دوپٹے سے ہی جُھل رہی تھیں۔ کسی کسی ڈبے سے شیر خوار بچوں کے رونے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ سکھاں گھٹنوں پر سر رکھے اس سارے منظر کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

بستی میں لائٹ گئی ہوئی تھی اسی لیے اسے دیکھے جانے کا امکان کم تھا۔ پھر بھی پانی کی تلاش میں وہ اجنبی اس تک پہنچ گیا تھا۔ وہ جو اپنے دھیان میں گم، ٹرین اور اس کے مسافروں کو دیکھ رہی تھی، ایک اجنبی نوجوان کو قریب آتا دیکھ کر گھبرا گئی۔ اجنبی نے اپنے موبائل ٹارچ کی روشنی میں اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ پھر کچھ قریب آ کر کہنے لگا:

''تھوڑا پانی ملے گا؟'' وہ اثبات میں سر ہلا کر اندر چلی گئی اور ایک کانچ کے گلاس میں پانی بھر لائی۔ اجنبی شاید بہت پیاسا تھا، دو گھونٹ میں ہی گلاس خالی کر گیا۔ اسی لمحے بجلی آ گئی۔ دروازہ کے اوپر لگا ساٹھ والٹ کا بلب روشن ہو گیا۔ اجنبی نے گلاس واپس سکھاں کی طرف بڑھایا۔ اجنبی کا حسین چہرہ محویت سے تکتے ہوئے اس نے گلاس پکڑنا چاہا تو اس کے ہاتھ سے سکھاں کا ہاتھ چھو گیا۔ اجنبی کے ہاتھ کا لمس کرنٹ بن کر سکھاں کے وجود میں دوڑ گیا اور چھناکے سے گلاس زمین پر گر کر کرچی کرچی ہو گیا۔ اجنبی اس کی محویت کو پا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وارفتگی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ مچلتی دیکھ کر سکھاں کی نظر جھکتی چلی گئی:

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اجنبی کے چہرے میں ہی نہیں آواز میں بھی جادو تھا اس کے وجود سے بڑی ہی پیاری مہک اٹھ رہی تھی۔

''سکھاں'' چنری کا کونا دانتوں میں دباتے ہوئے اس نے اپنا نام بتا دیا۔

''سکھاں۔ بڑا پیارا نام ہے تمھارا۔'' اسے لگا اس کے کانوں نے آج پہلی بار اپنا نام سنا ہے۔

''پڑھتی ہو؟''

''نہیں!''

''ہوں'' ہوں کہہ کر اجنبی آس پاس کے مکانوں کو دیکھنے لگا جیسے اندر ہی اندر کہہ رہا ہو۔ ان افلاس زدہ علاقوں میں رہنے والے لوگ کہاں اپنے بچوں کو پڑھاتے ہوں گے۔

''اتنی رات کو گھر سے باہر کیوں بیٹھی تھیں؟'' تنہا جوان لڑکی اہمیت دے تو کوئی کہاں ٹلتا ہے!

''ابا اماں رشید چاچا کی طرف گئے ہیں۔ بجلی بھی نہیں تھی۔ دل گھبرایا تو میں باہر آ گئی۔'' دل کی صاف لڑکی سب کچھ صاف صاف کہہ گئی۔

''گھر میں تنہا ہو؟'' اجنبی کی آنکھوں میں کچھ چمک پیدا ہوئی پر وہ سمجھی نہیں۔

''نہیں نہیں! بشیر اور نذیر ہیں نا''

''بشیر نذیر؟'' اجنبی کے حلق میں کچھ اٹکا تھا

''بھائی ہیں میرے'' وہ غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہوا۔

''اچھا اچھا بھائی ہیں'' اسی پل انجن نے سیٹی بجائی۔ دونوں نے اُدھر دیکھا پھر ایک دوسرے کو۔

''چلتا ہوں'' الٹے قدموں پلٹتے ہوئے اجنبی نے کہا۔ پھر رکا اور تیزی سے اس کے قریب آیا۔ سکھاں کا تو جیسے دم ہی رک گیا تھا۔ وہ پیار سے اس کے گال کو چھو کر بولا:

''ویسے تم ہو بہت پیاری'' پیار کا احساس اس کے گال پر چھوڑ کر وہ بھاگتا ہوا آہستہ آہستہ رفتار بڑھاتی ٹرین پر سوار ہو گیا۔ نگاہوں سے اوجھل ہونے تک سکھاں اجنبی کو اور اجنبی سکھاں کو دیکھتا رہا تھا۔ پر اسے کیا خبر ہو گی کہ وہ تو آج تک اسے سوتے جاگتے میں دیکھتی رہتی تھی۔

☆☆☆☆

''اماں میں نہیں کروں گی کسی قادر شادر سے شادی''

رات ابا آیا تو اس نے اماں کو بتایا ''میں نے قادر اور سکھاں کا رشتہ پکا کر دیا ہے۔ پندرہ دن بعد پائی کمالا بارات لے کر آئے گا قادر کی۔'' اور اب اماں اسے بتا رہی تھی۔

''نہ تو کیا کسی باؤ شاؤ سے کرے گی؟'' پرانے ٹرنک سے ریشمی کپڑے نکالتے ہوئے اماں ہنس کر بولی تو ایک اداسی سی سکھاں کے اندر اتر گئی۔ وہ خوابوں کی دنیا میں ضرور رہتی تھی پر اس تلخ حقیقت سے بھی واقف تھی کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ اسے کبھی نہیں ملے گا۔ اگر اس کی نظر میں سکھاں کی اہمیت ہوتی تو ایک بار تو آتا۔

''اماں کیا یہ ضروری ہے کہ غریب کو غریب اور کم صورت ہی ملے۔ ہمارے بھی تو کچھ خواب ہوتے ہیں ہمیں کچھ اچھا کیوں نہیں ملتا؟'' اس کے ہاتھوں میں پیاز اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ اب یہ تو وہی جانتی تھی کہ یہ آنسو

پیاز کے تھے یا دل میں اٹھنے والی ہوک کے۔

''نہ میری دِھی نہ ! ایسے کیوں سوچتی ہے تو؟ اللہ سائیں نے کیسے کیسے نواز ناہے، یہ تو وہی جانتا ہے۔ سن ! جنگل ہوتا ہے نہ جنگل، اس میں بڑے بڑے طاقتور جانور بھی ہوتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے معصوم بھی، پر جب تک وہ اپنے اپنے گلوں میں رہتے ہیں نا! ٹھیک رہتے ہیں۔ دوسری طرف نکل جائیں تو پس جاتے ہیں۔''

''رہن دے اماں ! ایسے تو غریب بیچارے صرف غربت میں ہی سڑتے مرتے رہیں اور امیر عیش ہی کرتے رہیں''اس نے بے دردی سے اپنی آنکھیں مسل ڈالیں۔

''ہاہاہ ! تو کیا جانے میری دِھی ! رب سوہنا دے کر بھی آزماتا ہے اور لے کر بھی، جسے جتنا زیادہ ملتا ہے اتنی ہی بڑی آزمائش میں پڑار ہتا ہے اور جسے نہیں ملتا اس کی صرف ایک ہی آزمائش ہوتی ہے صبر کی۔ جو اس آزمائش میں پورا اترتے ہیں انھیں دنیا کی کوئی حاجت نہیں رہتی۔ رب سوہنا آخرت کے خزانے ان پر لٹا دیتا ہے۔''اماں جیسے کسی اور ہی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔

''چھوڑ اماں ! تیرے فلسفے میری سمجھ سے باہر ہیں۔''اس نے کٹی ہوئی پیاز اٹھائی اور کڑھائی میں جلتے تیل میں جھونک دی جھناکے کے ساتھ شعلہ بھڑکا پھر بجھ گیا۔

☆☆☆☆

پندرہ دن بعد پائی کمالہ اپنے بیٹے قادر کی بارات لے آیا اور پندرہ دن سے نہ نہ کرتی سکھاں تین بار''ہاں'' کہہ کے قادر کے ساتھ ریل کی پٹریاں چھوڑ کر کورنگی کے ایک محلے میں آگئی۔ یہ اس کے باپ کے گھر سے کچھ بڑا گھر تھا اور ذرا بہتر حالت میں بھی تھا۔ جس کمرے میں سکھاں آئی وہاں ایک پلنگ، دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز پڑی ہوئی تھی۔ کاغذی پھولوں کی چند لڑیاں پلنگ کے ساتھ لٹک رہی تھیں۔ دروازے پر آہٹ ہوئی تو وہ سہم کر خود میں سمٹ سی گئی۔ وہ جانتی تھی آنے والا اس کے خوابوں کا شہزادہ نہیں تھا اور وہ تو اپنا تن من اجنبی کے سوا کسی اور کو سونپنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ آنے والا لڑیاں ہٹا کر اس کے بالکل قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کے وجود سے اٹھنے والی سستے سے عطر کی خوشبو سے سکھاں کا دل متلانے لگا۔ پانچ سو روپے منہ دکھائی کے نام پر اس کی جھولی میں ڈال کر قادر نے اس کا گھونگٹ پلٹ دیا۔ پلکوں کی گھنی جھالر اوپر اٹھی اور متحیر ہو کر وہیں جم گئی۔ سفید کڑکڑاتے قمیض شلوار میں ملبوس پچیس سالہ پکی رنگت کا قادر اپنی مخمور آنکھوں سے چاہت لٹا رہا تھا۔ گھنی مونچھیں اس کے کالے رنگ کو اور زیادہ نمایاں کر رہی تھی۔

''ماشاءاللہ ! کتنا خوش نصیب ہے رے قادر تو ! اتنی سوہنی دلہن ملی ہے تجھے'' ہلکے سے سرگوشیانہ انداز میں قادر اپنے نصیب پر رشک کر رہا تھا پر باریک سی گھٹی ہوئی آواز سن کر سکھاں کا سر مزید چکرا گیا۔ قادر کے ہاتھ نے اس کا گال چھوا تو اسے ابکائی آگئی اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر پلنگ سے اتر کر تیزی سے دروازہ کھولتی باہر کھرے کی طرف بھاگی۔ ایسی عجیب و غریب صورت حال پر قادر حیران پریشان رہ گیا اور پھر جب کچھ سمجھ آئی تو حواس باختہ سا سکھاں کے پیچھے بھاگا اور پیچھے سے اسے شانوں سے تھام لیا۔ بھاگ دوڑ کی آوازوں پر ساتھ والے کمرے سے قادر کی ماں بھی نکل آئی۔

''کیا ہوا ہے قادرے !''اماں نے معاملہ سمجھنے کے لئے قادر سے پوچھا۔

''کچھ نہیں اماں! بس ذرا سکھاں کا دل متلا گیا ہے۔ تو ذرا پھکی (چورن) تو لے آ''لباس سنبھالتی سکھاں قادر سے رخ پھیرے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نہ تو رہن دے! سب سمجھتی ہوں میں ان چھوکریوں کے ڈرامے''اماں کو سکھاں کی حرکت ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔

''نہ اماں نہ! ایسے نہ بول، اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آئی ہے۔ ابھی دکھ میں ہے۔ یہ تو ہماری خوشی کے واسطے آئی ہے۔ تو اپنا دل میلا نہ کر، ہماری توجہ اور چاہت اس کا دل خوش کرے گی تو اس کے وجود کی روشنی سے ہمارا گھر جگمگائے گا۔''میٹرک پاس قادر کی باتیں اماں کے پلے پڑیں یا نہیں پر وہ چپ چاپ پھکی لینے چل دی۔ قادر نے ابھی تک سکھاں کو تھام رکھا تھا۔ ابھی تو سکھاں نے اسے کوئی خوشی دی بھی نہیں تھی اور وہ اس کی خوشی اس کی چاہت کی بات کر رہا تھا۔ وہ دھیرے سے اس کی طرف گھومی قادر کے کالے وجود کے اندر اس کا اجلا دل جگمگا رہا تھا جس کی روشنی اس کی آنکھوں سے پھوٹ رہی تھی۔ سکھاں کے اندر کچھ ٹوٹ گیا، وہ گیلی مٹی کا ایک بت تھا۔ جس کی پوجا وہ پچھلے تین سال سے کر رہی تھی۔ پر اس لمحے اس پل قادر کا کالا وجود اس کے دل کے استھان پر براجمان ہو گیا تھا۔ بڑے پیار اور عزت کے ساتھ تھام کر قادر اسے کمرے میں لایا اور اب اس پیار، عزت اور مان کے بدلے میں سکھاں اسے ان خوشیوں سے نوازنے والی تھی جن کی چاہ میں وہ اسے بیاہ لایا تھا۔

غزلیات

احمد جہاں گیر

غزل

پرکھوں کے آثار اٹھائے، دُور نکلنے والا تھا
نوح کی کشتی چھوڑ کے جتّھا پیدل چلنے والا تھا

کس اسٹیشن پر جاتی تھی برزخ کی خاموش سرنگ
روح تمھاری جانی تھی یا جسم بدلنے والا تھا

گرد اودھ کی اُڑ جانی تھی، اور بنارس لٹنے تھے
میں اپنے لاہور کی مٹی منہ پر ملنے والا تھا

اچھا ہے اب آگ کو دھونکو، اور جلنے کی مشق کرو!
نکلے ہو جس راہ پہ کیا یہ رستہ چلنے والا تھا

ہاں بھیّا درویش، مسافر اپنی اپنی کھوہ میں ہیں
اتنی تھی برسات کے پورا برگد جلنے والا تھا

مولا کیا معصوم جگر بھی تیر سے چھدنے والے تھے
پیغمبر کے پاک بدن پہ آرا چلنے والا تھا

صہیب امین

غزل

ممکن ہے کون و مکاں سے آگے کوئی در نکلے
ٹیڑھے پیروں کے دل سے گر ہجرت کا ڈر نکلے

میں نے بس ظاہر دیکھا ، رکھتا گیا الماری میں
خط صحرا کے تھے مگر بارش کے پیغمبر نکلے

ہر سُو ہلچل تھی اور انگشت بہ دنداں تھے دشمن
جب جنگ سے پہلے شہزادے کے بال و پر نکلے

جب دشتِ فردا مجھ کو جگاتا اور بُلاتا ہے
میں دیکھوں زادِ سفر اپنا تو مٹھی بھر نکلے

تیری یادوں کی بارش بالکل بھادوں جیسی ہے
دل کا کوئی گوشہ سوکھا تو کوئی تر نکلے

عمروں کی جدائی کو رو کر بس اتنی کمائی کی
میرے سونے جیسے آنسو آخر کنکر نکلے

ندیم راجہ

غزل

زندگی کی جھاڑیوں سے باغ کا رستہ لیا
اس کو آنکھوں پر بٹھا کر پاؤں کا بوسہ لیا

پیڑ کی تخلیق رب نے کی پرندوں کے لیے
آدمی نے ان پرندوں کے لیے پنجرہ لیا

عین ممکن ہے میں تیرے پانیوں پہ تھوک دوں
تیرے دریا سے کسی نے ایک بھی قطرہ لیا

سوچ باقی کیا بچوں گا میں زمانے کے لیے
میرے اندر سے کبھی تو نے اگر حصہ لیا

آج دونوں ہی غزل کہتے ہیں اپنے طرز کی
اس نے سگریٹ اور میں نے ہاتھ میں بستہ لیا

ہم ترے گھر کا پتہ لے کر بڑے ہی خوش ہوئے
چور نے جیسے خزانے کا کوئی نقشہ لیا

مشکلوں کا ایک دم ہونے لگا سیدھا حساب
صرف اتنا تھا کہ میں نے پانچ کا ہندسہ لیا

....

بھاگنے کی رسم سے میں بھاگتا ہوں اس لیے
مر ہی جاؤں گا جو تیرے باپ نے صدمہ لیا

مجھ کو حیرت سی ہوئی اس آدمی کی جیت پر
کیا لیا جو صرف تیرے جسم کا قبضہ لیا

کیفیت محسوس کی میں نے تمہارے بعد کی
زندگی کی فلم روکی سانس سے وقفہ لیا

سعید شارق

غزل

دیکھ! شہزادی! اک تیرے ہونٹوں کی جنبش سے کیا بن گیا!
میں جو اب تک فقط عام سا شخص تھا، دیوتا بن گیا

اب اسی کی خنک روشنی میں تجھے دیکھ لیتا ہوں میں
میرے تاریک دل میں ترا زخم کیسا دیا بن گیا!

آخرِ کار چپکا لیے اپنی شاخوں سے مصنوعی پھول
سب ہرے ہو چکے تھے، سو کیا کرتا؟ میں بھی ہرا بن گیا

جانے کب کوئی نادیدہ خامہ مجھے دفعتاً کاٹ دے!
ایسا لگتا ہے جیسے مرے گرد بھی دائرہ بن گیا

سوچتے سوچتے آ لگا مجھ سے بھی اک نشانِ سوال
کن مسائل کو حل کرتے کرتے میں خود مسئلہ بن گیا!

دل کی کچی سڑک پختہ ہونے کی خواہش میں بے چین تھی
اور اتنے میں پھر تیز بارش ہوئی اور گڑھا بن گیا

کائنات احمد

غزل

پتنگا جل اُٹھا لیکن دیے میں ضم نہ ہوا
فقیرِ عشق کسی سلسلے میں ضم نہ ہوا

یہ دل ہے اور بجھی آگ میں سلگتا ہے
یہ وہ شجر ہے جو آتش کدے میں ضم نہ ہوا

سب ایک دوسرے کی راہ تکتے ڈوب گئے
کوئی ستارہ کسی دوسرے میں ضم نہ ہوا

حیات اچٹتی نگاہوں کی طرح سے گزری
سفر عجیب تھا جو راستے میں ضم نہ ہوا

ہمارا چہرہ بھٹکتا پھرا بس آنکھوں میں
ہمارا عکس کسی آئنے میں ضم نہ ہوا

نظمیں

علی زیوف

بھوسے کی کتھا

میں بھوسے کے ڈھیر میں گم گئی
وہ سوئی کھوجنے نکلا ہوں
جو آخری ملاقات کے خمیازے میں
تم نے اپنے سنہری بالوں سے نکال کر
میری بٹن ٹیک میں ٹانکی تھی
تاکہ میرے ہجوں سے
چاک سینہ بھدا دیکھائی نہ دے
میرے پاس۔۔۔۔!!
آج بھی وہی پرانی سائیکل ہے
جس پر میں گندم کے خشک خوشے
بھوسے کی غرض سے لادتا ہوں
جس کا چین فرضی پگڈنڈیوں پر سفر کرنے سے اتر جاتا ہے
محبت کی عمر اک سائیکل یا سائیکل سوار جتنی ہوتی ہے
یا اس خوش بخت پہیے جتنی
جو خاردار راستوں پر پنکچر نہ ہو
یا اس بھوسے کی خشک دھڑ جتنی
جس کو کسی تیلی نے راکھ نہ کیا ہو
میرا اپھٹا گلوبند گردن کے گرد تنگ ہوتا جا رہا ہے

....

میرا سینہ اب جلترنگ نہیں
میری سائیکل اب ہموار راستوں پر
آئے روز پنکچر ہو جاتی ہے
دل کوئلوں کی مانند جلتا ہے
ذات سلگتی رہتی ہے
زنگ آلود پنکچر ڈ پہیوں سے فرضی پگڈنڈیوں پر مزید سفر ممکن نہیں

میں شاید کبھی بھوسے کے ڈھیر سے زندگی دان کرتی سوئی نہیں کھوج سکوں گا

سدرہ سحر عمران

بیوہ عورتوں کا تہوار

حق مہر کی رات
ہمارے مرد
زیورات کی طرح چھینے گئے
اور ہمارے کانوں نے
نکاح کے پھول اتار کر
بیوگی کے سیاہ عقیق پہن لئے

کلائیوں کی چھنک
قیدیوں کی یاد میں قتل ہو گئی
اور نکاح نامے
نحوست کے جالوں کی طرح
ہماری بے رنگ آنکھوں پر تنے رہ گئے

مٹی کے گلدانوں میں
کوئی پھول دار راتیں سجانے نہیں پہنچا
خوشبو تہوار کی عمر پوری ہونے تک
اپنی جڑیں کاٹتی رہی

بدن کی سیڑھیوں پر
تازہ لہو کی آہٹیں
سانپ کے مانند سر سراتی ہیں
تو آنکھ کے کچے برآمدوں میں
بہت سی کنواری آوازیں بین کرنے لگتی ہیں

مہناز انجم

ٹرائی اینگل

تین جونکیں تعلق کا میٹھا لہو پی رہی ہیں
گھنی دھوپ کے لان میں
وہ نہیں رینگتیں
کمرۂ مشترک کی فضا کو کسیلا کیے جا رہی ہیں
انڈیلے ہیں کتنی رگوں سے
لہو کے کٹورے رذیلوں نے
اپنے شکم کی بھڑکتی ہُوئی آگ میں
ایک منہ زور، فربہ بدن کی کثافت کی کالک کو
کاغذ کے منہ پر ملے جا رہی ہے
مگر دوسری تو غبارہ صفت
سوزنِ وقت کی نوک کے ڈر سے
لرزہ براندام ہے
تیسری سن رسیدہ ہے
اور زعمِ بخیہ گری میں گھلی جا رہی ہے
میں ہنستی ہوں
قدرت نے کیچڑ نما پانیوں کا تقرب
انھیں سونپ کر
اِن کے منہ کو لہو کی حلاوت سے کڑوا کیا
جس تمنا میں لڑھکیں
جہاں بھی کھپیں
اِن کو ہر آئینے کی تب و تاب میں
خوب دھندلا کیا
خوب تنہا کیا

طاہر راجپوت

دھوپ کا ٹکڑا

دھوپ کا ٹکڑا میلا نہیں ہوتا
وہ ہر شکل میں ڈھل جاتا ہے
ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے
ایک پرندے کی طرح وہ کمرے میں آ جاتا ہے
اور فرش پہ اوندھے منہ پڑا ہے
لیکن وہ اڑ نہیں سکتا
دھوپ کا ٹکڑا کسی کچھوے کی طرح مٹی پہ پڑا ہے
لیکن وہ چل نہیں سکتا
وہ لمبے سفر سے آیا ہے
کئی سورجوں کی مسافت طے کر کے
کئی اداس راستوں سے گزرتا ہوا وہ یہاں تک پہنچا ہے

ننھے بچے اس پہ اچھل کود کر رہے ہیں
وہ خود ایک ننھے بچے کی طرح ان سے کھیل رہا ہے
وہ سورجوں کے راستے میں تنہا تھا
وہ ان کے پاؤں سے لپٹ جاتا ہے
وہ کسی لمس کا ترسا ہے
راستے میں کسی چیز نے اس کو چھوا نہیں ہے
ان کے جوتوں کی مٹی اس کے منہ پہ لگ جاتی ہے
وہ اسے جھاڑتا نہیں

....

وہ مٹی لگے چہرے کے ساتھ پیارا لگتا ہے
بچوں کے گدلے چہرے کی طرح

دھوپ کا ٹکڑا
چلنے والوں کے راستے میں بیٹھا ہے
فٹ پاتھ پہ بیٹھے فقیر کی طرح
لوگ اپنے خوابوں میں مست
ابھی رات کی نیند سے جاگے نہیں ہیں
ابھی اس خواب سے نکلے نہیں ہیں
وہ جلدی جلدی چلتے جا رہے ہیں
اپنے دفاتر کو
اپنے ٹھیلوں کو
دکانوں کی طرف
اور تھکے قدموں سے اس کی مسکراہٹ کو روندر ہے ہیں
دھوپ کا ٹکڑا
ایک بلی کی طرح بیٹھا ہے
ابھی وہ اپنی دم جھاڑے گا اور پاس چلتی نہر میں کود جائے گا

ثاقب ندیم

دیا طاق سے گر گیا ہے

زمانے ہوئے ہیں
تمنا کی سولی پہ لٹکے ہوئے
نرم خواہش کی الجھی ہوئی ڈور کا اک سرا
ڈھونڈتے ڈھونڈتے زندگی لگ گئی
اور میں ہوں کہ حسرت کی الگن پہ
ٹکا ہوا چیتھڑا، بے صدا، بے بصر
پل سرکتے گئے
خواب کی ڈور نے ہاتھ زخمی کیے
ایک ٹوٹی ہوئی نیند کی کرچیاں
آنکھ دہلیز پر، سانس محوِ سفر، کس طرف
جس طرف ایک آنسو بہا
خاکِ امروز کی کنجِ خاموش میں جا گرا
تب سوالوں کی ساعت کی تجسیم کا حوصلہ کس میں تھا؟
بس مقدر تعلق کی تفہیم کا آئنہ ہو گیا
اور آوارگی پھر بدن اوڑھ کر چل پڑی
نیند کی بستیوں میں سرِ شام ہی جو جلایا گیا تھا دیا، بجھ گیا
طاق خاموش ہے
کھڑکیاں کھٹکھٹاتی ہوا کے مقدر میں وحشت ہے
اور رات کے صحن میں
لڑکھڑائی ہوئی یاد زخمی پڑی ہے
دیا طاق سے گر گیا ہے
ذرا دور کل شام سے
رات کا جسدِ خاکی نگاہیں جھکائے کھڑا ہے